پھول کھلنے دو

واجدہ تبسم



پھول کھلنے دو

واجدہ تبسم

اورسیز بک سنٹر

۵۴ - جوہو ولے پارلے اسکیم - ۱. نارتھ لنکن روڈ
بمبئی ۵۸

اپنے بھائی

جاں نثار اختر کے نام

سلسلہ مطبوعات نمبر ۴

طبع اوّل اکتوبر ۱۹۷۷ء

ناشر : سراج الدولہ

پبلیشر : اورسیز بک سینٹر بمبئی

طابع : ٹیپو سلطان

مطبع : یونیورسل لیتھو پریس ۲۳ نوروجی اسٹریٹ بمبئی ۲

قیمت : ۱۲ روپے

-•★•-

"میں بھگوان سے پرارتھنا کروں گا کہ
مرنے کے بعد اگر دوسرا جنم ملتا ہے تو میں
ہریجن بنا کر پیدا کیا جاؤں۔"

مہاتما گاندھی

پھول کھِلنے دو

رات کے اندھیرے میں بھی دور ہی سے ایک بورڈ چمک چمک کر اپنی اہمیت کا اعلان کرتا نظر آتا تھا ـــــ

"شانتی ڈاملے میٹرنٹی ہوم" ـــــ

سیاہ، مہیب سنّاٹے کو چیرتی ہوئی ایک آواز دور سے اب قریب سنائی دینے لگی ـــــ یہ بیل گاڑی کی چرخ چوں چرخ چوں کی آواز تھی ـــــ شاید کوئی حاملہ اسمیں تڑپ رہی تھی کیونکہ گاڑی کی چرخ چوں سے ہٹ کر کبھی کبھی ایک تیز نسوانی چیخ بھی سنّاٹے میں گونج گونج اُٹھتی تھی ـــــ

گاڑی پھاٹک میں داخل ہوئی اور آواز سنتے ہی لیڈی ڈاکٹر شانتی ڈاملے برآمدے میں نکل آئی ۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ آج نرس بھی چھٹی پر تھی اور دایا بھی ـــــ جو کچھ کرنا تھا ڈاکٹر ہی کو اکیلے کرنا تھا ـــــ

ساتھ میں کوئی مرد نہیں تھا ـــــ حاملہ عورت کو سہارا دے کر ایک بوڑھی سی ملگجی عورت نے بمشکل اُتارا ـــــ انسانی ہمدردی کے جذبے سے چور ڈاکٹر لپک کر سیڑھیاں اتری اور ایک طرف سے سہارا دے کر دونوں حاملہ کو لیبر روم تک لے آئیں ـــــ

"مائی تم باہر ہی بیٹھو ـــــ میں تمھاری بیٹی کو ابھی دیکھتی ہوں"

"میں اسکی پڑوسن ہوں ___" بڑھیا نے غیر ضروری سا جواب دیا ___

"کوئی بات نہیں ___ تم باہر ہی بیٹھو ___"

حاملہ کو ٹیبل پر لِٹا کر لیڈی ڈاکٹر نے صابون سے ہاتھ دھوئے اور دستانے چڑھا رہی تھی کہ حاملہ نے عجیب لجاجت آمیز لہجے میں، اتنے درد اور کرب کی حالت میں بھی اُسے مخاطب کیا ___

"میم صاحب ___ مجھے بیٹا چاہیئے ___"

ڈاکٹر پہلے تو متعجب ہوئی ___ پھر ذرا مسکرائی ۔

"بائی ___ یہ تو بھگوان کے ہاتھ ہے ۔ میں تو صرف تمھاری تکلیف ہی دور کر سکتی ہوں ___"

حاملہ چیخ کر اُٹھ بیٹھی ___ "نہیں ___ نہیں ۔ مجھے بیٹا ہی دینا میم صاحب ۔ آگے ہی میری دو ___ دو بیٹیاں موجود ہیں اور ان کے باپ نے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر اب کے بیٹی ہوئی تو وہ ہم سبھوں کو مار ڈالے گا ...... میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں میم صاحب .... دیکھونا اسی لئے تو ساتھ میں آیا بھی نہیں .... لیڈی ڈاکٹر نے تیزی سے آگے بڑھ کر اُسے لِٹا دیا ___ تیز درد کی ایک اور لہر نے حاملہ کو پھر سے بے حال کر دیا تھا ___ لیکن وہ اس درد کو بھول کر کہے جا رہی تھی ___

"میم صاحب ___ اگر قسمت سے بیٹی ہی ہو جائے تو تم اُسے مار ڈالنا مگر مجھے اب اور بیٹی کی ماں مت بنانا ___" ڈاکٹر اسکی بک بک کو بھول کر اپنے پیشے کے روایتی انہماک میں جُت گئی تھی ___

"تم یہ کیوں سوچتی ہو کہ تمہیں بیٹی ہی ہو گی ۔ بھگوان بیٹا بھی تو دے سکتا ہے ___"

وہ اُسکے پیٹ پر اسٹھیٹسکوپ لگائے، کان قریب کئے بچّے کی دھڑکن بھی سنتی جا رہی تھی ___

"بھگوان ہم غریبوں پر اتنی دیا کیوں کرنے لگا؟ بیٹے تو وہ بڑے لوگوں کو دیتا ہے ۔ ہمیں تو غریبی بڑھانے کیلئے بیٹیاں ہی ملتی .... درد کی ایک تیز لہر نے پھر سے اسکی

زبان روک دی۔

"اچھا اب تم چپ چاپ پڑی رہو۔ زیادہ باتیں کروگی تو زچگی میں مشکل ہو جائے گی۔ سانس روکوگی تو بچہ جلدی پیدا ہوگا......

اس وقت تک درد کی لہر آکر جا چکی تھی اور حاملہ پھر سے اپنی ضد پر مستعد تھی ــــ

"میم صاحب اگر بیٹی ہو ہی گئی تو تم ہاسپٹل کے کسی بیٹے سے میری بیٹی بدل دینا ــــ سارا کام تو تم کرتی ہو کسی کو کیا پتہ چلے گا کہ کس کو بیٹا ہوا تھا اور کس کو بیٹی ...."

ابھی ڈاکٹر نے اسے غصّہ سے گھورا ہی تھا کہ باہر سے کار کے ہارن کی تیز آواز سُنائی دی ــــ شاید کسی بڑے آدمی کے گھر کا کیس آ گیا تھا۔ کیونکہ اطراف و اکناف میں ساری غریب آبادی تھی کسی کسی کے پاس ہی گاڑی تھی ــــ

"یا مصیبت ــــ" ڈاکٹر نے دل ہی دل میں سوچا۔ آج اسٹاف چھٹی پر ہے اور دو دو کیس ــــ خیر بھگوان مالک ہے" ــــ

ڈاکٹر پہلے کیس کو چھوڑ کر دوسرے کیس کی طرف لپکی۔ بہو کو ساس لے کر آئی تھیں ــــ کپڑوں اور زیوروں سے ہی اعلیٰ رکھ رکھاؤ کا پتہ چل رہا تھا۔ آتے ہی ساس نے سنا دیا یوں جیسے ڈاکٹر پر احسان کر رہی ہوں ــــ

"بہو کا کیس تو شہر کے ہاسپٹل میں تھا، مگر رائے بہادر اتفاق سے کسی کام سے شہر گئے ہوئے ہیں، درد اُٹھا تو بھاگم بھاگ ہم یہیں لے آئے ــــ"

ڈاکٹر اس قسم کے نخروں کی عادی تھی۔ مُسکرا کر بولی ــــ

"کوئی بات نہیں ــــ میں ابھی انہیں بھی دیکھتی ہوں"

ڈاکٹر نے باہر جھانکا کہ پہلی حاملہ کے ساتھ والی پڑوسن کو چائے کافی کے لئے کہے، مگر وہ پڑوس کا حق نبھا کر واپس جا چکی تھی ــــ باہر گاڑی میں ڈرائیور اور ایک دو نوکر بیٹھے بیڑی سگریٹ پی رہے تھے ــــ

"کیا مصیبت ہے ــــ اس نے ذرا جھلا کر سوچا۔ اب کافی بھی مجھے ہی بنا کر دینی پڑے گی"۔

وہ کافی کے لیئے دودھ گرم کرنے مڑی ہی تھی کہ پہلی والی حاملہ کی تیز چیخوں کو سن کر تیزی سے دوڑی آئی ــــ بچہ پیدا ہونے ہی کو تھا۔

سارا سامان تو تیار تھا ہی ــــ کمرے میں دوسری طرف ایک اور ٹیبل تھا جس پر رائے صاحب کی بیوی لیٹی ہوئی تھی، بیچ میں پردہ پڑا ہوا تھا ــــ دو حاملہ عورتیں ایک ہی کمرے میں ہوں تو ڈاکٹری کے اصول سے بیچ میں پردہ تان دیا جاتا ہے کہ ایک دوسری کو دیکھ کر دہشت زدہ نہ ہوں ــــ

بڑی مایوسی سے لیڈی ڈاکٹر نے دیکھا ــــ پہلی حاملہ کو پھر سے لڑکی ہی پیدا ہوئی تھی!

"لیکن مجھے ابھی سے اسے اطلاع نہیں دینی چاہیئے۔ زچہ کے لیئے غم کی یا خوشی کی غیر متوقع خبر کبھی کبھی جان لیوا بھی ثابت ہو جاتی ہے ــــ" وہ مسٹر بڑ کرتی رہی۔ بیچ بیچ میں پہلی عورت کی آوازیں ابھرتی رہیں ــــ

"میم صاحب مجھے کیا پیدا ہوا ہے ــــ"

"میم صاحب لڑکا ہی ہے نا ــــ"؟

"میم صاحب لڑکا ....

ڈاکٹر نے ذرا خوش دلی سے کہا ــــ "اتاؤلی کیوں ہوئی جا رہی ہو ــــ ابھی بتا دیں گے۔ اور تم سے مٹھائی بھی کھائیں گے ــــ"

وہ اداسی سے بولی ــــ "مٹھائی ہم غریب کہاں سے کھلائیں گے میم صاحب۔ یہاں تو روٹی کے ہی لالے پڑے رہتے ہیں .. ..

ڈاکٹر ہنس کر بولی "تو اچھا ہے ہم تمہیں کھلا دیں گے ــــ"

بچی کچی چلا چلا کے روئے جا رہی تھی "تھینک گاڈ۔ چھوٹے بچے کی آواز سے

پتہ نہیں چل سکتا کہ لڑکا ہے یا لڑکی ——— ورنہ یہ عورت اپنا کیا حشر کر ڈالتی ؟"

اُسی وقت دوسری حاملہ ، لنبے لیے چینی کا مظاہرہ کرنا شروع کیا ——— ڈاکٹر تیزی سے اُسکے قریب پہونچی ——— کبھی کبھی حاملہ کی تکلیف کم کرنے کیلئے اُسے باتوں میں بہلانا بھی بہت سُود مند ثابت ہوتا ہے ———

"آپ کا نام کیا ہے "——— ڈاکٹر مسکرا کر بولی ۔

"ریکھا "——— ریکھا اپنے آپ کو سنبھال کر بولی ۔

پھر اُس نے ذرا غور سے ڈاکٹر کو دیکھا اور اتنی تکلیف کے باوجود ذرا سا ہنس کر بولی ——— "آپ بڑی سندر ہیں ڈاکٹر "———

ڈاکٹر ذرا دکھ سے مُسکرائی ——— "ہاں مگر اتنی بھی نہیں کسی کے بھاگ کی ریکھا بن پاتی ———"

"آپ نے شادی نہیں کی ڈاکٹر ......" ریکھا نے اپنی بات کے جواب سے پہلے سے پیٹ پکڑ لیا ——— مرگئی ——"

ڈاکٹر ہنسی ——— "آپکا پہلا بے بی تو نہیں ہے نا یہ ۔ پھر ذرا دھیرج سے کام لیجئے نا؟

" دوسرا ہے ——— ریکھا ہانپ کر بولی " پہلا بیٹا ہے ۔ اب مجھے تو بیٹی کی چاہت ہے مگر اتنے درد کے باوجود بھی وہ ہنسی " ماں جی کو بیٹا ہی چاہیئے ۔ اُنہیں پوتوں کی فوج چاہیئے ....

درد کی ایک اور لہر آکر گزر گئی تھی ، جو تڑپتی ہوئی عورت کو پھر واپس حواسوں میں لے آتی ہے ———

"میم صاحب ——————— مجھے میرے بیٹے کی صورت تو بتا دو " پہلی زچہ نے پھر پکارا ———

ڈاکٹر ہنس کر اُسکے قریب آئی ۔ اُس گال تھپکایا ۔

"بیٹے کا نام کیا رکھو گی ——" ؟

"ہندو" ـــــ عورت خوشی اور کچھ فخر سے بولی ـــــ

ڈاکٹر نے سہم کر اُسے دیکھا ـــــ اور کچھ رک رک کر پوچھا ـــــ

"ہریجن ہو" ـــــ ؟

عورت نے اُداسی سے سَر ہلا دیا ـــــ نہ بھی ہلاتی تو ڈاکٹر نام سے ہی سمجھ گئی تھی ـــــ بڑے لوگ ایسے چیپ نام نہیں رکھتے ـــــ ہندو۔ کلّو۔ ڈھیبو۔ یہ اور ایسے سارے نام اُسکی اپنی زندگی کی ساری داستان اُسے یاد دلاتے دیتے تھے ـــــ وہ خود بھی تو ایک نیچ ذات سے تھی !

اچانک اُس کا دِل دُکھ سے بھر گیا ـــــ اگر اُس عورت کو یہ معلوم ہو جائے کہ اُس نے پھر سے ایک لڑکی کو جنم دیا ہے تو شاید .... شاید وہ خود اپنی اور اس بچّی کا خاتمہ کر ڈالے ۔ یا شاید اُس کا شوہر سبھوں کو ختم کر دے ، یا گھر سے نکال دے ـــــ یا گھر چھوڑ کر خود کہیں چلا جائے ـــــ غریبی میں لڑکیاں ہی لڑکیاں ہونا کتنے دکھ کی بات ہے ۔ اُنہیں عذابوں سے پالنا ۔ بھوکی نگاہوں سے جوانی میں بچانا ۔ پھر شادی ! جو سراسر تھیلی بھر روپوں کا سوال تھی ـــــ

"کیا میں یہ گناہ مول لے لوں ـــــ ؟ بچّے بدل دوں ؟ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ رائے صاحب کی بیوی کو بیٹا ہی ہو ـــــ

وہ تیزی سے اُٹھی ـــــ مذہب ذات پات ، بھگوان خدا ، اُسکے لئے یہ سب چیزیں بے معنی تھیں ۔ زندگی نے اسکے ساتھ جو بھیانک سلوک کیا تھا تو وہ ہر چیز سے دستبردار ہو گئی تھی ۔ اِسی لئے نہ اسکے گھر میں مندر کا استھان تھا نہ کہیں بھگوان کی مورتی ـــــ ہاسپٹل میں بھی وہ یوں رہتی کہ کسی کو اسکے مذہب اور ذات پات کا اندازہ نہ ہوتا ـــــ لیکن اچانک ان دیکھی قوّت کے آگے اسکا ، سَر جھکا دینے کو جی چاہا ۔ ـــــ وہ اپنے کمرے میں گئی ۔ کیلنڈر پر کسی دیوتا کی فوٹو تھی ۔ پتہ نہیں وشنو بھگوان تھے ، یا کرشن یا ہنومان جی ـــــ اُس نے برسوں بعد پہرا تھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑ

کر آنکھیں بند کیں اور سر جھکا کر دل ہی دل میں بولی۔

"اگر تو دلوں کی تڑپتی دعا واقعی سنتا ہے تو آج میں اپنے لیئے نہیں، کسی اور کے لیئے ایک دعا مانگتی ہوں ـــــ بھگوان ریکھا کو بیٹا دے دے ـــــ"

ڈاکٹر ـــــ باہر سے بوڑھی ساس کی تیز آواز سنائی دی اور وہ لپک کر لیبر روم میں پہونچی۔ ایک اور ہستی دنیا میں قدم رکھنے کے لیئے، اپنی قسمت میں لکھی تمام تر برائیوں اور اچھائیوں، تمام تر سکھ اور دکھ، جھیلنے کے لیئے کمربستہ ہو چکی تھی ـــــ

ڈاکٹر تیزی سے واش بیسن کی طرف بڑھ گئی ـــــ

چند منٹوں کی جدوجہد نے ایک عورت کو پرسکون کر دیا اور دوسری عورت ـــــ جو لیڈی ڈاکٹر تھی کا سکون لوٹ لیا ـــــ ریکھا کو بیٹا پیدا ہو گیا تھا ـــــ

چند لمحے پیشتر ڈاکٹر جس مستعدی سے کام کر رہی تھی وہ مفقود ہو چکی تھی ـــ ایک لمحے کے ہزارویں حصّے میں ہزاروں خیالات اسکے ذہن سے آ۔آ کر نکل جاتے تھے ـــــ

"نہیں نہیں میں یہ گناہ مول نہیں لوں گی۔ مجھے کیا، جس کے نصیب میں جو لکھا ہے وہ بھگتے گا ـــــ"

پھر دل اسے کچوکتا ـــــ "شانتی ڈاہلے۔ ذرا سوچو کس لجاجت سے وہ ہتر کی عورت تم سے بیٹے کی بھیک مانگ رہی تھی ـــــ اگر اسکے شوہر نے ایک پھول کو مار ڈالا تو چار جانوں کا خون تمھاری گردن پر ہوگا ـــــ"

مگر میں یہ ظلم کیسے کر دوں ـــ بچّے کیسے بدل دوں۔ ممکن ہے بھگوان نے اُن لوگوں کی زندگی ہی اتنی لکھی ہو"!

"ارے ذرا سوچو امیر گھر میں لڑکا کیا ـــــ لڑکی کیا۔ ٹھاٹ سے ہی رہیں گے ـــــ ویسے ریکھا خود لڑکی چاہ رہی تھی۔ اور ......"

اُس نے گھبرا کر اپنے آپ کو دیکھا ـــــ پسینہ نہ صرف قطرہ قطرہ، بلکہ موجیں

بن کر اسکے وجود کو ڈبوئے دینے پر تلا ہوا تھا ____ اس نے ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے کی خاطر کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا ____ اور باہر کا منظر دیکھتے ہی اس کا خون اسکی رگوں میں منجمد ہو گیا رہ گیا ____

باہر رائے صاحب کھڑے تھے ____

رائے صاحب اشوک چکرورتی!

اس کا اپنا اشوک!! جو اسے وقت کی بے رحم موجوں کے حوالے کر گیا تھا اور پھر کبھی پلٹ کر خبر نہ لی تھی ____ جس کے ہاتھوں اس نے اپنی زندگی۔ خوبصورتی اور جوانی کا ہر ہر لمحہ سونپ دیا تھا۔ اور جب اسکے پیٹ میں ننھی سی جان کلبلانے لگی تھی اور اس نے شادی کے لئے کہا تھا تو اس نے وہی امیروں کی روایتی بے رحمی کے ساتھ کہا تھا۔

"ہم سے ہنسی دل لگی میں ایک بے وقوفی ہو گئی تھی۔ کیا تم ابارشن نہیں کروا سکیں ____"

"ابارشن" ____؟ اس نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"ہاں ہاں ابارشن ____ آخر کالج میں پڑھنے والی ایک لڑکی اس لفظ سے معنی تو جانتی ہی ہو گی۔ یا پھر ڈکشنری میں دیکھ لو ____"!

"اشوک ____" وہ جیسے ڈوبتے ڈوبتے بولی۔

"لیکن اگر ہم شادی کر لیں تو اپنا بچّہ محفوظ بھی کر سکتے ہیں ____"

"شادی ____"؟ وہ بید اجنبی بن کر بولا ____

"شادی کیسے ممکن ہے ____ ساری دنیا جانتی ہے تم ہریجن لڑکی ہو ____ اور ڈیڈی ____؟ کیا تم سمجھتی ہو ڈیڈی مجھے اسکی اجازت دے دیں گے ____"؟

اور پھر وہ اسکی مرضی کے بغیر اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے یہاں لے گیا اور زبردستی الٹی سیدھی دوائیں پلا کر اسے اس جنت سے محروم کر دیا جو ماں بننے پر ہی قدرت کسی بھی عورت کے قدموں تلے تعمیر کرتی ہے ____

اس نے تیزی سے پردہ کھینچ دیا ____ وہ ایسے نادیدے سے رائے صاحب کو دیکھ

رہی تھی کہ وہ اُسے دیکھ نہیں سکے تھے ___ اُس نے بمشکل خود کو کرسی پر گرا دیا ___

" رائے صاحب ___ زندگی بھر کبھی بھگوان کو نہیں مانا۔ آج مان گئی ___ کیونکہ بھگوان نہ ہوتا تو کون سی طاقت تھی جو مجھے تم جیسے نیچ سے بدلہ لینے کا موقع عطا کرتی ___؟ اب تمہارا بچہ ___ تمہارے جگر کا ٹکڑا ہریجن بستی میں پلے گا ___ بیگار میں گھسیٹا جائے گا۔ زمینداروں کے جوتے کھائے گا۔ امیروں کی گالیاں سمیٹے گا اور میں قہقہے لگاؤں گی "!

" ڈاکٹر " ___ ریکھا کی کانپتی آواز آئی ___

" بیٹا یا بیٹی " ___؟

ڈاکٹر اٹھ کر اسکے قریب گئی ___ ایک بار پھر اس کا دل ڈگمگا گیا ___

" اب بھی وقت ہے۔ اب بھی وقت ہے ___ گناہوں سے بچنے کا ___ نیکیاں سمیٹنے کا "

پھر اچانک اُسے اپنی زندگی بھر کی محرومیاں اور دکھ یاد آئے ___ عجیب مخمصے میں جان تھی ___

" اتنی جلدی کیا ہے ___ ابھی دیکھ ہی لینا نا ___ " وہ بظاہر مسکرائی ___ مگر دل میں آگ سی لگی ہوئی تھی ___

اچانک دروازہ کھلا اور نرس داخل ہوئی ___

" ارے سسٹر ___ تم ___ " ڈاکٹر بے حد حیرت زدہ ہو کر بولی ___ تم تو دو دن کی چھٹی لے کر گئی تھیں نا؟

" جی ہاں ___ لیکن شہر جانے والی آخری بس بھی نکل گئی تھی جب میں اسٹاپ پر پہنچی تو میں نے سوچا کہ چل کر آپ کو ہیلپ ہی کر دوں ___ اگلے ہفتہ چلی جاؤں گی ___ " پھر وہ مسکرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی بولی ___

" ارے میرے جاتے ہی آپ کو دو۔ دو کیس نپٹنے پڑے ___ ! پھر وہ ہنس کر آگے بڑھی سامنے ہی ٹیبل پر دو ننھی مُنی جانیں اپنے حال اور مستقبل سے بے خبر ٹھٹھرتی پڑی تھیں ___ نرس نے کپڑے اُٹھا کر دیکھا اور ہنسی ___ " ایک لڑکا۔ ایک لڑکی "! پھر مڑ کر ڈاکٹر سے بولی

" بیٹا کس کا ہے اور بیٹی کس کی ہے " ؟

لیڈی ڈاکٹر شانتی ڈاملے نے اپنے دھڑ دھڑ دھڑکتے دِل کو قابو میں کیا اور بمشکل بولی ۔

" بیٹا اس ہریجن عورت کا ہے ۔ اور بیٹی رائے بہادر اشوک چکرورتی کی ۔۔۔ "

ریکھا کی آنکھ لگ چکی تھی ورنہ وہ پوچھتی ضرور کہ میرے شوہر کا نام تمہیں کیسے کیسے معلوم ہوا، جبکہ ابھی میں نے بتایا تک نہیں ۔۔۔ !

دوسرے دن اس شدید خلفشار سے بچنے کی خاطر لیڈی ڈاکٹر ایک ہفتہ کے آرام کے لیئے شہر چلی گئی ۔۔۔ وہ اشوک کا کسی حال سامنا کرنے کیلئے تیار نہ تھی ۔ ویسے بھی نرس اس کی غیر موجودگی میں ہر کیس اچھی طرح سنبھال لیتی تھی ۔۔۔

جب وہ ہاسپٹل سے گھر جارہی تھی تو نرس دونوں بچوں کو تب تک نہلا چکی تھی ۔۔ بیٹی کو اسکی ماں کے پاس سلا کر اب وہ لڑکے کو گود میں اٹھائے ہوئے تھی ۔۔۔

" ڈاکٹر دیکھئے کتنا پیارا گل گوتھنا سا بچہ ہے ۔۔۔ ڈاکٹر سُن رہ گئی مگر نرس سُنائے گئی ،

" ہمارے یہاں ایسے تو کتنے بچے پیدا ہوتے ہیں مگر پتہ نہیں کیا بات ہے مجھے اتنا سوئیٹ کبھی کوئی بچہ نہ لگا ۔ اور ڈاکٹر ایک چیز نوٹ کی آپ نے ۔۔۔ اسکے سیدھے بازو پر ایک چاند کی طرح کا پیدائشی نشان ہے ۔ میری ماں کہتی ہیں کہ ایسے نشان کو پدم کہتے ہیں جو بہت ہی دھن وان اور بڑے آدمی ہونے کی نشان ہوتا ہے " اور اس نے اس کا چھوٹا سا ننھا منّا بازو کھول کر بتایا جہاں پر ایک چاند اس کے نصیبوں کی سیاہی پر مسکرا رہا تھا ۔۔۔ " !

لیڈی ڈاکٹر نے اپنے جذبات چھپاتے ہوئے لاپروائی سے کہا ۔۔۔

" اپنے اپنے نصیب کی بات ہے ۔۔۔ ہریجن کے ناں جنم تو لیا ہے پر کیا پتہ بھگوان واقعی

اسے بڑا آدمی بنا دے ــــ"

ویسے یہ بات کہتے کہتے خود اُسے بھی اس بچّے کے لفنیئے بیحد ترس آیا اور اُس نے اپنے آپ میں سوچا کہ زندگی کے گھور اندھیروں میں اب تو تمہارے لیئے روشنی کی ایک ہلکی سی رمق تک نہیں سوائے اس نام نہاد چاند کے جو قدرت نے تمہارے بازو پر طلوع کر دیا ہے"!

وقت کے نقّارے پر ایک ایک کر کے بارہ چوٹیں اور پڑیں ــــ قدرت کے مہربان اور نا مہربان ہاتھوں نے جو ادلا بدلی کر دی تھی اسکے میلے میں سلیکھا خوشیوں اور عیش کے جھولوں میں جھول رہی تھی اور بندو جوانی سے پہلے ہی بڑھاپے کی منزلیں طے کر رہا تھا ــــ

" جا ــ باپ کو یہ کھانا دے آ ــ" ماں نے اُسے آواز دی جو گلی کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا ــــ

" اور سُن ــــ ماں نے جاتے جاتے اُسے چتاؤنی دی ۔ زمیندار کی حویلی میں زیادہ دیر مت ٹھہرنا ۔ کوئی بھی ایسی ویسی شرارت کر دی تو پٹائی ہو گی ــ"

آج اُس کی بارہ سالہ زندگی کا پہلا واقعہ تھا کہ زمیندار کی حویلی کے درشن کرنے جا رہا تھا ۔ ماں اسلئے بھی اُسے بچا بچا کر رکھتی تھی کہ کسی کی نظر نہ پڑ جائے اور اوپر کے کام کے بہانے ابھی سے اسے چھین لیا جائے ۔ بندو اسکی جان تھا ۔ ایمان تھا ۔ اور بندو بھی ماں کا دیوانہ ۔

باپ کا کھانا لے کر جب وہ حویلی میں پہونچا تو اس نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا ــــ حویلی کے ساتھ ملے ہوئے میدان میں باپ جھاڑو دے رہا تھا ، لیکن عجیب و غریب بات یہ نہیں تھی کہ باپ جھاڑو دے رہا تھا ، عجیب و غریب بات یہ تھی کہ باپ کے پیٹھ کے پیچھے سے ہو کر ایک جھاڑو بندھی ہوئی تھی ــــ وہ جہاں بھی قدم رکھتا وہ جھاڑو اسکے

پیچھے پیچھے جاتی ـــــ جب جھاڑو دے چکا اور کیاریوں کی صفائی کرنے لگا تب بھی وہ جھاڑو یونہی بندھی لٹکی تھی۔

بالو ـــــ وہ کھانے کی پوٹلی رکھ کر حیرت سے بولا ـ "یہ تمہارے پیچھے جھاڑو کیوں لٹک رہی ہے ـــ"

باپ نے بعید لاپروائی سے جواب دیا ـــ "جہاں جہاں بھی میرے پاؤں، اس پوتر دھرتی پر پڑتے ہیں، پیروں کا نقش چھوڑ جاتے ہیں، انھی ناپاک نشانوں کو مٹانے کے لئے مجھے یہ جھاڑو ہمیشہ باندھے رکھنی پڑتی ہے۔" پھر وہ جھلا کر بولا ـ

مگر تجھے اِن تمام باتوں سے غرض ـــــ ؟ پاٹھ شالا گیا تھا یا نہیں ـــ" ؟

"نہیں ـــــ بندو جھلا کر بولا ـــــ پنسل ختم ہو گئی تھی، گرو جی نے اسکول سے باہر بھگا دیا"۔

باپ جل کر بولا ـــ "تو گھر جا کر مر ـــــ یہاں کیوں آیا مجھ سے سوال جواب کرنے ـــ" !

بندو نے دوسری ہی بات کی ـــــ "بالو اور جو حویلی والوں کے پاؤں کے نشان پڑتے ہیں تو وہ سب بھی جھاڑو باندھ کر گھومتے ہیں کیا ـــ" ؟

باپ نے گھبرا کر اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور پھر اس خطرناک چھوکرے کی طرف گھور کر بولا ـــــ "حرام زادے اُلٹا لٹکوائے گا کیا ـــ نکل یہاں سے ـــ"

بندو ذرا ڈر کر تھوڑی دور گیا ـــــ پھر کھڑا ہو گیا وہیں سے بولا ـــــ

"بالو ـــــ میں بڑا ہو جاؤں گا تو زمیندار کی کمر سے جھاڑو بندھوا دوں گا ـــ"

باپ رے ...... حرام زادے ـــــ ٹھہر تو سہی" باپ نے ایک پتھر اُٹھا کر زور سے بیٹے کی طرف اُچھالا ـــــ بندو تو ہٹ گیا، قسمت سے اُسی وقت زمیندار کا بڑا بیٹا وہاں آ نکلا اور پتھر سیدھا اُسکے ماتھے سے جا لگا ـــــ

"مر گیا ـــ" کہتے ہی وہ دوہرا ہو گیا ـ پورے باڑے میں ہلو رمچ گئی ـــــ مرد عورتیں، مالک نوکر سبھی نکل آئے ـــــ ایک جھاڑو کے پیچھے بندو کھڑا سارا تماشا دیکھتا رہا۔

"کیوں بے کلو ـــ" ایک بارعب آدمی نے بندو کے باپ کو مخاطب کیا ـــــ

"یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں ـــــ" اور ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی زور سے اسکے ماری۔

"کلّو تڑپ کر بولا ـــــ سرکار مائی باپ۔ غلطی ہو گئی ـــــ م ـ م ـ میں اصل میں اپنے چھوکرے کو مار رہا تھا کہ ......

"تیرا چھوکرا مر بھی جائے تو ہمارا کیا بگڑ جائے گا۔ سوال تو ہمارے بیٹے کا ہے ـــــ" پھر انہوں نے گردن گھما کر آواز دی ـــــ

"اسکو اپنے بیٹے اور ہمارے بیٹے میں فرق نہیں دکھتا ـــــ ذرا اسکی آنکھوں میں لال سرمہ تو لگاؤ تاکہ آنکھیں روشن ہو جائیں ـــــ"

ایک لڑکا جھٹ پٹ دوڑ کر پڑیا میں کچھ لے آیا ـــــ دو لڑکوں نے پکڑ کر کلّو کو لٹایا اور اس کی آنکھوں میں چٹکی چٹکی بھر پسی ہوئی لال مرچ جھونک دی ـــــ

کلّو ہائے ہائے کر کے کٹے ہوئے مرغ کی طرح اچھلنے لگا اور سب تماشہ دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگے ـــــ بندو تڑپ کر سامنے نکلا اور سیدھا زمیندار کے سامنے آکر بے باکی سے بولا

"چھوٹے سرکار کو پتھر لگا ضرور تھا، مگر خون تھوڑی نکلا۔"

"اچھا ـــــ زمیندار نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔" تو آپ عدالت لگانے آئے ہیں ......"

ابھی وہ کچھ حکم دینے ہی والے تھے کہ کلّو اپنی آنسو برساتی آنکھیں، آدھی کھلی، آدھی بند، بے حد زور سے چیختا گالیاں بکتا اٹھا اور گالیوں کے ساتھ ساتھ لاتوں اور گھونسوں سے بندو کو زمین پر ڈھیر کر دیا۔

"حرام زادے ـ سور کے جنے ـ قصور تو قصور اوپر سے زبان کھولتا ہے۔ آج تیری ہڈیوں کو چورا نہ کر دوں تو کلّو نام نہیں ـــــ"

زمیندار بیٹے کا ہاتھ تھام کر حویلی میں چلے گئے ـــــ دوسرے لوگوں نے کلّو کو روکا۔" ارے ناحق مر جائے گا۔ بس کر دے ـ بچہ ہی تو ہے ـــــ"

رات کو نمک ملے گرم پانی سے، شوہر کی آنکھوں پر ٹکور کرتے کرتے بندو کی

ماں بولی ـــ

"ایسے زمیندار کی نوکری ہی کیوں کرتے ہو جی جو ذرا گھش ہے ۔ بھلا یوں آنکھوں میں کوئی مرچی بھروا تا ہے ـــ"

کلّو پھر بندو پر لپکا ـــ یہ اس حرام زادے نے تجھ سے سب کہا ہوگا نا ـــ ؟ اس سے آگے ہزار بار میں نے جوتے کھائے ۔ گالیاں کھائیں ۔ اُلٹا لٹکوایا گیا ـــ آنکھوں میں مرچیں پھینں ـــ کبھی تجھ سے کچھ کہا ـــ یہ آج اس حرام زادے نے پہلی بار آتے ہی اتنا ہنگامہ کیا ۔ اسکو سالے کو نہ زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

دونوں لڑکیاں دبک کر کونوں میں ہو گئیں ۔ ماں ہاں ہاں کرتی رہی ، مگر کلّو پھر بندو پر جُٹ گیا ۔ بندو مار کھاتا رہا ۔ جب باپ خود ہی تھک گیا تو بندو بدتمیزی سے بولا ۔

"بڑے بہادر بنتے ہو تو ایک آدھ بار ایسی ٹھکائی زمیندار کی بھی کر دنا ـــ"

رائے زادہ اشوک چکرورتی ، شہر کے پلے بڑھے کالج کے پڑھے لکھے ، جوانی پوری شہر میں گذری ، لیکن باپ نے جب زمینداری سنبھالنے کا کہا تو انہیں بھی ایسی کوئی بری بات نہ لگی ۔ اچھی خاصی ترقی یافتہ زمینداری تھی ـــ جدید سامان سے آراستہ ـــ کھیتی باڑی کا کام ہل بیل سے بھی چلتا اور اب نیا نیا ٹریکٹر بھی آیا ہوا تھا ـــ گھر کی کار تھی ۔ گھوڑے تھے ۔ بڑی سی حویلی تھی ـــ شہر کی پڑھی لکھی برابری کی حیثیت والی لڑکی سے باپ نے شادی بھی کرادی تھی ۔ سبھی کچھ میسّر تھا ۔ گاؤں میں رہے تو کیا ـــ پھر فاصلہ بھی کون بڑا تھا ، اور گھر کی کار میسّر تھی تو جب جی چاہے جا سکتے تھے سو باپ کے کہے کو پورا کیا اور پوری زمینداری باپ کے جیتے جی ہی سنبھال لی ـــ اونچی حیثیت کے اور بھی کئی گھرانے گاؤں میں تھے مگر ان کی حیثیت ثانی ہوتی تھی ـــ اسی طرح گاؤں غریبوں اور خاص طور سے ہریجنوں سے بھی بھرا پڑا تھا ، مگر آزادی مل جانے کے باوجود بھی ان کا حال وہی پہلے جیسا تھا ، بلکہ پہلے سے بھی بدتر ۔ کیونکہ

پہلے تو بھی یہ بات تھی کہ انگریز سبھی کو ایک لاٹھی سے ہانکتا تھا، اسکے لئے سبھی ہریجن تھے اور وہ سب کا آقا ــــ لیکن آزادی کے بعد اپنے ہی لوگ حاکم بن بیٹھے اور بات بن بات آنکھیں نکالنے لگے ــــ

ایسے ہی سینکڑوں گھرانوں میں سے ایک کلّو کا بھی تھا ــــ کئی ہریجن دوسرے اونچی ذات والوں کے گھروں اور کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ کلّو خوش نصیبی یا بدنصیبی سے اشوک رائے زادہ کی جاگیر تھا ــــ وہ اُن کے گھر بار، بڑی سی حویلی کے بھی متعدد کام کرتا اور کھیتوں پر بھی جاتا۔ قاعدے کے مطابق اسکی اولاد کو بھی اسی جگہ بعد میں کام ملنا چاہئیے تھا جہاں وہ کرتا رہا تھا، اور اُس نے اپنے طور پر سوچ رکھا تھا کہ بندو کو دھیرے دھیرے سارے کاموں سے واقف کرواتا جائیگا، لیکن پہلے ہی دن آکر اس نے جس ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا تھا اُس نے اندر ہی اندر اُسے سہما دیا تھا ــــ

اُس دن کام پر جاتے ہوئے اُس نے اپنی بیوی کو جتا دیا ــــ

"دیکھ آگے سے اب اُس حرام زادے کو میرے پاس نہ حویلی پر بھجوانا نہ کھیت پر ــــ بن ناحق کو مصیبت"!

"پاٹھ شالہ سے آکر کوئی کام بھی تو نہیں رہتا اُسے۔ کسی چھوٹے موٹے دھندے سے کیوں نہیں لگا دیتے۔ چار پیسے آئیں گے تو کچھ ہاتھ بھی کھلے گا۔ یہاں تو وہی، کسی دن بھر پیٹ کسی دن آدھا پیٹ اور کسی دن فاقہ"!

کلّو جھلّا کر بولا ــــ" آج ہی سارے جھگڑے نمٹانے ہیں کیا ــــ بعد میں سوچیں گے ــــ"

لیکن رکمنی نے اُسی وقت ایک چھوٹا موٹا دھندہ سوچ لیا تھا ــــ اس نے مارے شوق کے یونہی اپنے جھونپڑے کے پچھواڑے پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے۔ کوئی کوئی عورت بڑی بھاگ بھری ہوتی ہے کہ اسکے ہاتھ کے لگائے پھل پھول خوب پھلتے ہیں بھوڑے ہی ہفتوں میں پچھواڑا مہکنے لگا تھا ــــ اُس نے سوچ لیا تھا کہ پھولوں کے گجرے بنا کر بندو

کے ہاتھ بکوا دیا کرے گی ـــــ مندر پر پھول چڑھانے والوں کی بُہتات ہوتی ہے، سنیچر اور منگل کو تو خوب ہی پھول بکیں گے ـــــ

پہلے ہی دن ایک ہنگامہ ہو گیا ـــ ایک پنڈت جی نے بندو سے ایک گجرا خرید کر بھگوان کے چرنوں میں ارپت کر دیا ـــ ایک پنڈت نے ایک مالا بھگوان کے گلے میں ڈال دی ـــ باقی ہار پھول بھی جلد ہی بک گئے ـــ جب جلدی جلدی پیسے سمیٹ کر خوشی سے باولا اتاولا بندو چلنے ہی کو تھا کہ ایک کرخت صورت والے آدمی نے اُسے گردن سے پکڑ لیا ـــ

"کیوں بے ـــ ؟ ہمارا دھرم بھرشٹ کرے گا ـــ"

دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا ٹھٹ لگ گیا ـــ جس آدمی نے اُسے گلے سے پکڑا تھا وہ حویلی میں زمیندار کا گُرگا تھا اور جس دن سیتھر والی واردات ہوئی تھی وہ بندو کو اکڑ کر بات کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا ـــ

"یہ لونڈا آگے چل کر بہت حرام زادہ ثابت ہو گا، کیوں نہ اُسے ابھی سے کچل دیا جائے ـــ"؟

"اوہوں ہوں ـــ" ایک نے بیچ میں دخل دیا ـــ جس کا بیج ہے، اُس سے نمٹا جائے اِس کا کیا ہے"۔

بتیرا بولا ـــ

"سالا ہریجن نیچ ذات کا ہو کر پوجا کے پھول بیچتا ہے۔ بھگوان کی مورتی ناپاک نہ ہو گئی ہو گی اس کی بلی ہی کیوں نہ دے دی جائے کہ بھگوان خوش ہو جائیں ـــ"

ذرا پڑھے لکھے ایک صاحب بولے ـــ "مگر اسکو پھول بیچنے کا آئیڈیا آیا کیسے ـــ"؟

"کیوں بے ـــ تجھے پھول بیچنے کا کون بولا ـــ"؟

ایک نے بندو کی گردن دبائی جو آگے ہی چوہا بنا کھڑا ہر ایک کی رنگ رنگ کی بولی سُن رہا تھا ـــ وہ کچھ نہ بولا تو ایک نے پیچھے سے دھمو کا جڑا ـــ "ابے بول ـــ"

اُس نے اپنے خالی پیٹ کو تھپ تھپایا ــــ

"سالا ہیرو بنتا ہے ــــ کوئی بولا ــــ پیٹ بجا کر بتا رہا ہے۔ منہ سے نہیں بول سکتا ــــ"

مقدمہ زمیندار کی عدالت میں پیش ہوا۔ بڑا نرم فیصلہ سنایا گیا ــــ

"جب تک باپ کا دباؤ اولاد پر نہ پڑے۔ اولاد نہیں سُدھر سکتی، اسلئے باپ کی ہی تنبیہ ہونی چاہیئے۔ پہلوان ــــ زمیندار نے اپنے ایک مسٹنڈے کی طرف اشارہ کیا ــــ کلّو کو اپنی چارپائی کے نیچے ایک گھنٹے کے لئے سُلا دو ــــ

بہتر ہے سرکار ــــ پہلوان سعادت مندی سے بولا ــــ پھر سب کے سامنے ایک مضبوط پایوں والی چارپائی لائی گئی ــــ کلّو کو زمین پر چت لٹا کر دو پائے ہتھیلیوں پر اور دو پاؤں پر رکھے گئے اور دھم سے پہلوان چارپائی پر جا کودا ــــ

"ارے مر گیا ــــ ارے مر گیا ــــ" چاروں پلٹے پہلوان کے وزن سے اسکی ہتھیلیوں اور پاؤں کو پیسنے لگے اور کلّو دہائیاں دینے لگا ــــ

بندو نے اپنا غصّہ اور اُبال روکنے کو اتنی زور سے اپنی مٹھیاں بھینچیں کہ اسکے ناخن ہتھیلیوں میں گڑ گئے اور باپ بیٹے دونوں کی ہتھیلیاں مہندی سے رنگ گئیں ــــ

کئی دنوں تک دونوں کے ہاتھوں کے زخم ہرے رہے ــــ کلّو پھر بھی کام پر جاتا رہا ــــ بندو کا دل رفتہ رفتہ زندگی اور اس ماحول سے اُچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ ماں سے وہ عجیب عجیب انہونی باتیں کرتا ــــ ایسی باتیں جنھیں سُنکر ماں اس کا منہ اپنے ہاتھوں بند کر دیتی ــــ پاٹ شالہ سے آکر وہ یونہی اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا ــــ ایک دن وہ تالاب کے پاس والے رامو چاچا کے ہاں جا نکلا ــــ وہ بھی ہریجن ہی تھے۔ بڑی محبت والے ــــ یا کم سے کم بندو یہی سمجھتا تھا ــــ وہ گیا تو دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ چاچی تو کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھیں اور رامو کاکا اپنی چھوٹی بیٹی کو گود میں لیئے اسکے

پاؤں ٹیڑھے کرتا بیٹھا تھا اور بچی تھی کہ چیخ چیخ کر روئے جاتی تھی ـــــ

"کاکا ـــــ یہ تم کیا کر رہے ہو؟" بندو کچھ سہم کر بولا ـــــ

"کچھ نہیں بیٹا ـــــ ذرا بس اُسکے پاؤں ہی تو ٹیڑھے کر رہا ہوں" وہ مزید پٹیاں کستے ہوئے بولا۔ "دیکھ اتنے دِن کی کوشش اب ذرا کچھ کامیاب ہو رہی ہے" ـــــ

"مگر کیوں کاکا ـــــ" اب کے ذرا غصے سے بولا ـ

"ارے بیٹا ـ بڑی ہو کر بھی کیا کرے گی ـــــ پہلے تو بیگار بھرے گی ـــــ تیرے میرے گھر کام کرے گی ـــــ" پھر اِس سے بے خبر کے سننے والا بارہ تیرہ برس کا چھوکرا ہے کہے گیا ـــــ" پھر اس کے بستر سے اُس کے بستر میں ـ اور آخر میں وُہی کیڑے مکوڑوں کی زندگی ـــــ تو بیٹا اِس سے اچھا ہے کہ معذور کر کے ڈال دو کہ کوئی بھی ترس کھا کر ایک دو سکے پھینک دے" ـــــ

بندو راہو کاکا کے چہرے کو دیکھے گیا ـــــ دیکھے گیا ـــــ پھر دھیرے دھیرے بولا۔

"یہ دُنیا میں امیر لوگ کہاں سے پیدا ہو گئے" ـــــ

وہ ہنسا ـــــ "ارے بیٹا جتنے امیر لوگ ہیں نا ـ یہ سب غریبوں کا پیسہ چھین چھین کر امیر ہو گئے ہیں" ـــــ

"مگر کاکا اِن لوگوں کے پاس تو پیسہ تھا ہی نہیں ـ پھر چھیننے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے ـــــ ہو نہ ہو یہ خرابی بھگوان کی ہے" ـــــ

لڑکی بُری طرح روئے جا رہی تھی ـــــ کاکا زور سے آخری پٹی لپیٹتے ہوئے بولا۔

ـــــ "بھگوان کی ہو یا انسان کی ـــــ بیٹا اصل میں یہ سوال ایسا ٹیڑھا ہے کہ بھگوان خود بھی حل نہیں کر سکتا" ـــــ

بندو کا دِل جیسے ننھی بچی کی پٹیوں میں خود بھی جکڑ کر رہ گیا ـــــ

اُس دِن تالاب کے پاس والے میدان میں چند لڑکے مِل کر گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے کہ بندو بھی جا نکلا ـــــ سب اونچی ذات والوں کے لڑکے تھے ـ زمیندار کا بیٹا بھی ان میں

موجود تھا۔۔۔ سب کو پتہ تھا کہ بندو گلّی اُڑانے میں طاق ہے۔ اسے دیکھ کر ذرا سمٹ سے گئے۔۔۔

"اے بندو۔۔۔ داؤ دیگا" ایک لڑکا خوش دلی سے پکار کر بولا۔۔۔

"مگر بے ایمانی نہیں کرنا۔۔۔ ہاں" بندو بولا۔۔۔

زمیندار کا بیٹا اسے غصّے سے دیکھ کر بولا۔۔۔

"تم لوگ اسکے ساتھ کھیلوگے۔۔۔؟ ڈیڈی منع کرتے ہیں۔۔۔ یہ نیچ ذات کے لوگ۔ انکے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا چاہئیے نہ کھیلنا۔۔۔"

بندو کا مُنہ اُتر گیا۔۔۔ دوسرا بولا۔۔۔

"ارے یار کھیل میں کیا ہرج ہے۔ ہم کوئی اسکے ساتھ کھا پی رہے ہیں"؟

چھوٹے سرکار بولے۔۔۔ "نہیں نہیں اُسکے ہاتھ کی چھوئی گلّی ہم چھوئیں گے تو ہم اور ہمارا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔۔۔ دادی ماں نے منع کیا ہے۔۔۔"

بندو یونہی کھڑا رہ گیا۔۔۔ کسی لڑکے نے گلّی کو جو ڈنڈا رسید کیا تو وہ دور میدان میں جا گری۔۔۔ چھوٹے سرکار بولے۔۔۔

"اے بندو بہت دور گلّی جا کر گری ہے کون جائے۔۔۔ تو ہی دوڑ کر اُٹھالا"

بندو ڈھٹائی سے بولا۔۔۔ اب میں اُٹھا کر لاؤں گا تو گلّی ناپاک نہیں ہو گی۔۔۔ کھیلنا تو تم اور تمہارا دھرم بھرشٹ ہو جاتے۔۔۔؟

"حرام زادے۔۔۔ زبان چلاتا ہے۔۔۔" اور ایک کرارا چانٹا اسکے گال پر پڑا۔۔۔

ایک ہاتھ گال پہ رکھ کر بندو سیدھا چھوٹے سرکار کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔۔۔ "زمیندار کے بیٹے۔۔۔ میری ماں کہتی ہے کبھی بھی کسی سے قرض لو تو اسے واپس کر دیا کرو۔ آج میں تمہارا یہ قرضہ سنبھال کر رکھ رہا ہوں۔۔۔ کسی دن تمھیں ضرور واپس کر دوں گا۔۔۔ اور دُگنا چگنا کر کے۔۔۔ واپس کردوں گا۔۔۔

چاول اُن دِنوں سونا ہوا جا رہا تھا ـــــ ویسے تو ہوش سنبھالنے پر بندو نے سدا جواری کی روٹی ہی کھائی تھی۔ سالن کی دِکھاون تو کم ہی نصیب ہوتی تھی ہاں پیاز نمک اور مرچ ضرور مِل جایا کرتی تھی۔ زندگی میں تینوں بھائی بہنوں نے کبھی کبھار ہی چاول دیکھے تھے۔ وہ بھی جب بڑے اور اونچی ذات کے گھرانوں میں کسی کی شادی یا موت ہوتی اور نیچ ذات والوں کو پُن کمانے کی خاطر کِھلایا جاتا تب ـــــ

فصلیں کٹ کر گھر میں آ رہی تھیں۔ بڑی چوکسی سے اَناج کی صفائی ہوتی اور سال بھر کے لیئے گوداموں میں اسٹور کروایا جاتا ـــــ ایک دِن بہت رات پڑے بھی بالو گھر نہ لوٹا تو محبت کا مارا بندو باپ کی خبر لینے ماں کی چوری سے حویلی جا پہونچا ـــ مگر دُور ہی سے، جھاڑ کی آڑ سے ـــــ دیکھتا رہا۔ پہلے تو اُس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ آیا یہ کیا ماجرا ہے پھر ذرا غور سے دیکھا تو کچھ بات پلّے پڑی ـــــ

بالو کے دونوں پیروں میں موٹی موٹی زنجیریں بندھی ہوئی تھی اور زنجیروں کے ساتھ بڑے بڑے دو پتھر گھسٹتے ہوئے چلتے ـــــ یہ تو اُس نے دیکھ لیا کہ پتھر بندھے ہوئے ہیں، مگر کیوں بندھے ہوئے ہیں یہ وہ نہ سمجھ نہ پایا۔ اور بالو ایسا بے زبان جانور تھا کہ باہر کی بات گھر میں آکر بولتا ہی نہ تھا ـــــ بس کام سے آئے، منہ ہاتھ دھوئے ـــــ کھانا کھایا اور کونے میں مُنہ دے کر سو رہے ـــــ ختم ـــــ صبح ہوئی پھر وہی پرانا چکّر ـــــ

آس پاس کچھ کھڑ بڑ ہوئی تو بندو بندر کی سی پھرتی سے جھاڑ پر چڑھ ہو گیا ـــــ زمیندار کا منشی آیا ـــــ پھر ایک ایک پر گرجا برسا۔ سب کا حساب کتاب صاف کیا ـــــ پھر ایک نوکر کو بلا کر کہا ـــــ "کلو کی تلاشی لے لے کہ چاول باندھ کر کہیں کمر وکمر میں چھپا تو نہیں رکھے ـــــ"

جب نوکر تلاشی لے کر بول چکا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے تو اُسے حکم مِلا کہ اب گھر جائے ــــ

کلّو مسمسی سی صورت بنا کر آگے کی اُور جھکا اور منشی کے پیر چھو کر بولا ــ

"مائی باپ ــــ میں تو برسوں کا پرانا نمک کھانے والا آدمی ہوں ــــ اب بھی مجھ پر بھروسہ نہیں ۔ روز روز وزنی زنجیریں اور پتھر باندھنے سے میرے ٹخنے اور پیر چھِل گئے ہیں ۔ میں سچ کہتا ہوں حضور میں چاول کا ایک دانہ بھی کبھی گھر نہیں لے جاؤں گا مگر یہ سزا ختم کر دیں ــــ"

"ابے چل چل ــــ ہم نے کئی ایسے شاطر چور دیکھے ہیں جو طرح طرح سے چوری کرتے ہیں. اسی لئے سرکار نے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے ــــ زنجیر پیروں میں بجتی بھی ہے اور پتھروں سے بندھی ہونے سے وزنی بھی ہو جاتی ہے تو کوئی بھاگ نہیں سکتا ۔ چوری نہیں کر سکتا ۔ سمجھا حرام خور ......

کلّو سر ہلا کر رہ گیا ــــ بندو کا سارا خون اس کی آنکھوں میں اُتر آیا ــــ مگر قدرت کلّو پہ مہربان تھی ۔ اُس رات موت نے ایسی زنجیر اسکے پیروں میں باندھی کہ زندگی پھر اُسے کبھی گھسیٹ نہ سکی ــــ

اور وہ دِن ایک ایسا دِن تھا جس دِن زندگی نے ایک نیا موڑ لیا ــــ! برسات کا مہربان پانی بنجر اور زرخیز زمین، دونوں پر ایک ساتھ برستا ہے. غریب ہو یا امیر، جوانی ہر ایک کے چہرے پہ بغیر تخصیص گلال بکھیر دیتی ہے ــــ

بندو تینوں میں سب سے چھوٹا تھا ــــ دونوں بہنیں ابھی اتنی بڑی تو نہ تھیں لیکن غریبی کی مشقت کچھ جلد ہی ہاتھ پاؤں کھول دیتی ہے ــــ تانی بڑی تھی اور رجّی چھوٹی ۔ دونوں جنگل سے لکڑیاں کاٹنے جاتی تھیں ۔ بنڈل بنا کر لاکے محلّے گاؤں میں، یا ہاٹ بھرتا، تو اور دوسری ہریجن عورتوں کی طرح بیچنے آتی تھیں ــــ

اُس دِن بندو تانی اور رجّی کے ساتھ لکڑیاں کاٹنے گیا ہوا تھا ـــــ کلہاڑی لے کر وہ جھاڑ پہ چڑھا ہوا تھا ۔ نیچے تانی اور رجّی لکڑیاں جمع کر رہی تھیں ۔ لکڑیاں بہت سی جمع ہو گئیں تو رجّی بولی "۔ اتنی لکڑیاں تو ہم سے اُٹھیں گی نہیں ۔ میں ماں کو بلا کر لاتی ہوں ـ"

رجّی کے جانے کے بعد ہی ہبڑ ہبڑ گھوڑے کی ٹاپیں سُنائی دیں اور عین اُس جھاڑ کے نیچے گھوڑا آکر ٹھہر گیا ـــ گھوڑے پر زمیندار بیٹھا ہوا تھا ـــــ

تانی کو دیکھ کر زمیندار یونہی بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا ۔ اسکی آنکھیں مارے ہوس کے پھیل کر رہ گئیں ۔ تانی ایک انجانے خوف کے مارے ہٹتے ہٹتے جھاڑ کے تنے سے جا لگی ـــ ماحول کا تناؤ کم کرنے وہ ڈری ڈری سی آواز میں یونہی بولی ـــ

"م ـــ م ـــ میں لکڑیاں سمیٹنے آئی ہوں ـ"

زمیندار ایک مکار سی ہنسی ہنس کر بولا ـــ "ہم بھی تو کچھ سمیٹنے ہی یہاں رُکے ہیں"! پھر وہ گھوڑے سے نیچے اُتر آیا ـــ جانے کتنے لمحے یونہی شکاری اپنے شکار کو تکتا رہا کہ دور سے کسی آتا دیکھ کر تانی ذرا جرأت پا کر چلائی ـــ

"ماں ـــ"!

رُکمنی تیز تیز قدم اُٹھاتی آئی اور قریب آکر ٹھٹھک کر رہ گئی ـــ رجّی بھی یونہی سہمی کھڑی رہ گئی ۔ زمیندار نے پلٹ کر دیکھا اور ہنس کر بولا ـــ

"جوان جوان چھوکریوں کی ماں بھی اتنی جوان اور دلکش ہو سکتی ہے ـــ؟ واہ بھئی واہ ۔ تو پھر پہلے شاخ کا ہی حساب صاف کرلیں ـــ ٹہنیوں سے بعد میں نپٹتے رہیں گے ـــ"

جیسے ہی زمیندار نے رکمنی کی ساڑی کا پلّو کھینچا ۔ اوپر بندو نے اور نیچے لڑکیوں نے منہ پھیر لئے ـــ ماں چیخی چلائی ـــ

"بھگوان کے لئے مجھ پہ رحم کرو ـــ میری بیوگی پہ ترس کھاؤ ـــ میرے اپنے بچوں کے سامنے مجھے ننگی نہ کرو ـــ"

لیکن شیطان آج ساری رسیاں تڑا چکا تھا ـــ ماں سے نپٹ کر وہ تانی کی طرف

مڑا ـــ اُسنے ایک پھول کی طرح اُٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور گھوڑے پر بیٹھا، یہ جا وہ جا ـــ چھو ہو گیا ـــ

کتنا عجیب حادثہ تھا ـــ وہ اوپر بیٹھا دیکھتا رہا ـــ ہاتھ پیروں میں ہلنے بھر کی بھی سکت نہ رہ گئی تھی ـــ ماں پھر دھیرے دھیرے اُٹھی ـــ اپنے کپڑے برابر کئے ـ چھوٹی بیٹی کا ہاتھ پکڑا ـــ سامنے والے کنوئیں کی گگر پر آ گئی ـــ اشارے سے بیٹی سے کہا ایک ڈول پانی کھینچ ـــ جب وہ پانی کھینچنے کو جھکی تو اُسے دھکا دے کر کنوئیں میں گرا دیا اور دوسرے ہی لمحے خود بھی کنوئیں میں کود پڑی ـــ

دوسرے دن گاؤں کے ایک اور کنوئیں سے تانی کی بھی لاش ملی ـــ پتہ نہیں زمیندار نے ڈلوا دیا تھا یا وہ غیرت کے مارے خود ہی کود گئی تھی ـــ لیکن جب اُس سے راموں کا کانے روتے روتے پوچھا تھا ـــ

" بیٹا تیرا تو سارا گھر بار ہی ایک ساتھ اُجڑ گیا ـ ماں بھی دونوں بہنیں بھی ـــ اب تو کہاں جائے گا ـــ "

تو وہ پاگلوں کی طرح منہ اُٹھائے تکتا رہا ـــ

لیکن اُس رات جب سارا گاؤں نیند کے مزے لوٹ رہا تھا ـــ وہ ہر قسم کے ڈر سے خوف سے بے پرواہ منہ اُٹھا کے ایک طرف چل دیا ـــ جہاں بھی قسمت لے جائے ـــ!

شہر نے بھی اُس سے کوئی بہت خوبصورت سلوک نہیں کیا ـــ فاقے، دھکے، جوتے ہر ذلت اس کا مقدر بنی ساتھ پھرتی رہی ـــ مگر گاؤں میں ہر جگہ جو اچھوت اور ہریجن کہہ کہہ کر اُسے اُسکے ماں باپ اور گھر والوں کو دھتکارا جاتا تھا، اُس سے کسی حد تک یہاں چھٹکارا مل گیا تھا، کیونکہ اتنے بڑے شہر میں کون کسے پہچاننے اور پوچھنے چلا تھا ـــ لیکن اچھوت ہونے کی جو چھاپ اُس کے ماتھے اور زندگی پر لگ چکی تھی وہ اُسے دھو دینا چاہتا تھا ـــ تو وہ

تو وہ کم عمر لیکن یہ بات اُس نے اچھی طرح جان لی تھی کہ اسکی زندگی کا سب سے بڑا روگ ہی یہ تھا کہ وہ اچھوت تھا ـــــ اور اب اُس نے اپنے آپ کو جتا دیا تھا کہ بیٹا اگر کہیں بھی، کوئی بھی تم سے پوچھے کہ تم کون ہو تو صاف کہہ دینا کہ میں برہمن ہوں ـــــ نام بدلنے کو کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں" ـــــ ؟؟ کوئی تمہارے اندر تو جھانک کر نہیں دیکھتا نا کہ تمہاری ذات کیا ہے۔؟

۲

اور اُس دن سے اُس نے اپنا چلن سا بنا لیا ـــــ چلتے پھرتے سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے بس ایک سبق اپنے آپ کو سکھائے جاتا ـــــ

"میں اچھوت نہیں ہوں" ـــــ

"میں اچھوت نہیں ہوں" ـــــ

"میں اچھوت نہیں ہوں" ـــــ

وقت کے نقارے پر کچھ اور چوٹیں پڑیں اور دُنیا میں دیکھے جانے والے چند اور ایسے خوابوں کا اضافہ ہو گیا جن کی کوئی خوبصورت تعبیر نہیں ملتی ـــــ اندھی آنکھوں کے بے رنگ خواب ـــــ جلتی جوانی کے سلگتے خواب ـــــ!

یہ آنکھیں سندو کی آنکھیں تھیں ـــــ جو خواب ویسے بھی کم دیکھتی تھیں اور اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی ناانصافی زیادہ ـــــ

بہت دنوں سے وہ قلی، مزدوری، بھاڑا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے بیزار سا ہو گیا تھا، کیونکہ شہر کی بات اور اصول ـــــ ہر جگہ اپنے اپنے آدمی لگے رہتے تھے ـــــ نئے آدمی کو گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔ اسی لئے کچھ دنوں سے وہ ایک ہاتھ گاڑی والے کے ساتھ لگ گیا تھا ـــــ وزنی وزنی بوجھے ڈھوتے اسکی کمر ٹوٹنے لگتی ـــــ آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگتا، لیکن وہ جیئے

جا رہا تھا۔ جتنے پیسے ملتے وہ اپنی ڈاب میں سنبھال سنبھال کر رکھے جاتا ــــ بھوک بہت زور کرتی تو چند پیسوں کے چنے پھانک لیتا یا سستے قسم کی ہوٹل میں کم سے کم پیسوں میں پیٹ کی دوزخ بھر لیتا ــــ

ایک دن وزن کی زیادتی اور بھوک کے غلبے نے ایسا زور کیا کہ وہ چکرا کر گر پڑا ــــ اسے پتہ نہیں بعد میں کیا ہوا کیونکہ وہ بے ہوش ہو چکا تھا ــــ لیکن ہوش آیا تو خود پہ ایک بہت بوڑھے اور مہربان چہرے کو جھکا پایا ــــ

"شکر ہے تم ہوش میں آ گئے بیٹا ــــ" وہ اجنبی بوڑھا خوش ہو کر بولا ــــ میں تو گھبرا ہی گیا تھا۔ تم کون ہو بیٹا ــــ کہاں کے رہنے ...." لیکن بوڑھے کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ تیزی سے بول اُٹھا ــــ

"میں اچھوت نہیں ہوں ــــ"

بوڑھے نے حد درجہ حیرت سے اُسے دیکھا ــــ دیکھتا ہی گیا ــــ اچانک بندو کو احساس ہوا کہ وہ غلط جگہ غلط جواب دے گیا ہے ــــ کچھ شرمندہ سا ہو کر بولا ــــ

"میں ایک مزدور ہوں بابا ــــ مگر آپ کون ہیں"

"میں ایک بڈھا ہوں بیٹا" بوڑھا نرمی سے ہنسا " اور بوڑھے جب اور بوڑھے ہو جاتے ہیں اور کسی بے سہارا کو سڑک پر بے ہوش دیکھ لیتے ہیں تو اسے اپنا بیٹا بنا لیا کرتے ہیں ــــ"

یہ محبت ــــ یہ خلوص ــــ یہ انسانیت تو اُسے زندگی میں آج تک کبھی نہیں ملی تھی۔ یہ فرشتہ کون تھا جو اتنے سالوں اسکی زندگی سے دور رہا تھا ــــ وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا ــــ وہ اس محبت بھری شخصیت سے لپٹنے کو بے قرار ہو اٹھا، کچھ آگے بھی بڑھا، لیکن اس صاف ستھرے بوڑھے کو دیکھ کر اُسنے اپنے میلے کچیلے وجود کو دیکھا اور ٹھٹھک کر رہ گیا ــــ

بوڑھا اچانک اٹھا اور اُسے گلے لگا کر محبت سے بولا ــــ "تن کا میل کوئی چیز نہیں ہے بیٹا بڑی بات یہ ہے کہ من میلا نہ ہو ــــ"

زندگی میں پہلی بار چوبیس سالہ بندو، بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا ـــــ

بوڑھے بابا نے سڑک سے اسے بے ہوشی کی حالت میں اٹھایا تھا اور واقعی بابا نے اُسے ہوش عطا کر دیا ـــــ بابا کے ساتھ رہ کر اُس نے زندگی کا صحیح روپ دیکھا، نیکی اور انسانیت کی صحیح اقدار کو پرکھا ـــــ وہ اکثر سوچتا " زندگی میں مجھے بابا نہ ملتے تو میں کتنا ادھورا بکھرا بکھرا اور ٹوٹا ہوا رہتا ـــ "

بابا جب کبھی نماز پڑھتا، جب کبھی قرآن شریف پڑھتا اور بیحد عجز و انکساری سے خدا کے حضور گڑگڑاتا، بندو اُسے سخت حیرت اور تعجب سے دیکھتا ـــ دیکھے جاتا ـــ

" بابا ـــ " ایک دن وہ بولا ـــ " میں نے آپ سی کوئی شخصیت نہیں دیکھی "

بابا نے قرآن شریف جزدان میں لپیٹ کر رکھا اور مسکرا دیا ـــ جیسے پوچھ رہا ہو ـــ ایسی کیا انوکھی بات ہے مجھ میں ـــ ؟

" بابا میں سمجھتا ہوں کہ ہم انسان ـــ عبادت کو بطور سکّے کے استعمال کرتے ہیں، ہم عبادت پوجا اسی لئے تو کرتے ہیں کہ جواب میں ہمیں خدا، بھگوان جو مانگیں دے دیتا ہے، جیسے کسی بھی دکاندار کو آپ سکّہ دے کر کوئی سی چیز خرید لیتے ہیں۔ اسی طرح ہم عبادت اسلئے نہیں کرتے کہ ہمیں اوپر والے سے کوئی لگاؤ یا محبت یا عقیدت ہے، بس دین لین کا سا معاملہ ہے ـــ وہ ہنسا ـــ لیکن بابا آپ .... آپ عبادت کو صرف عبادت سمجھ کر ادا کرتے ہیں ـــ میں نے آپ کو بدلے میں خدا سے کچھ مانگتے نہیں دیکھا " !

بابا نے ہنس کر اُسے دیکھا ـــ " خدا ہمیں کچھ نہ دے، تو بھی کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ جتنی بھی دیر ہم خدا کے حضور میں رہتے ہیں اُس سے قریب رہتے ہیں " ـــ !!

" بابا ـــ لرزتی ہوئی آواز میں بندو بولا ـــ " میں نے نہ کبھی مندروں میں جھانکا نہ بھگوان کی مورتیوں کو ہی دیکھا ـــ لیکن اب کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو .... آپ کو

.....آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا ـــــ
کتنی بار آنسو بھی تو زبان کا حق ادا کر دیتے ہیں ـــــ؟

بندو کو بابا اپنے ہی جھونپڑے میں اٹھا لائے تھے ـــــ بندو کو سخت شرم آتی تھی کہ بوڑھا بابا خود ہی گھر کا سارا کام کرتے، کھانا بھی پکاتے اور ایک ماں کی طرح کھانا پروس کر بندو کو آواز دیتے ـــــ

"میاں پہلے کھانا کھالے ـــ پڑھائی لکھائی بعد میں ہوتی رہے گی"۔ حد یہ کہ سارا خرچہ وہی اٹھا رہے تھے ـــــ

دن بھر بندو لوہے کا بھنگار، کچرا، ہاتھ گاڑی میں ادھر سے اُدھر کرتا رہتا۔ رات کو کام سے لوٹتا تو خالی وقت میں پڑھتا رہتا ـــــ اپنے تکلیف دہ بچپن کی یادوں میں سب سے تلخ یاد اسکے ذہن کو یہ ڈستی تھی کہ وہ اچھی طرح تعلیم بھی حاصل نہ کر سکا تھا ـــ

دو دن پہلے انگلی پر ہتھوڑی لگ جانے کی وجہ بابا کے ہاتھ پر سوجن آگئی تھی، اور بندو سخت شرم محسوس کر رہا تھا کہ اس حالت میں بھی بابا ہی کام کریں ـــــ وہ مستعدی سے جتا ہوا تھا۔

"بابا آج آپ میرا کمال دیکھئے ـــــ ایسی بڑھیا روٹی کھلاؤں گا کہ بس ـــــ" اس نے پتیلی میں آٹا نکال کر بھر لوٹا پانی اسمیں جھونک دیا اور بعد پریشان ہو گیا کہ پتیلی سے آٹا تو جانے کدھر غائب ہو گیا تھا صرف پانی ہی پانی موجیں مار رہا تھا ـــــ بابا بڑی سنجیدگی سے بولا ـــــ

"میاں میرے خیال سے تم کھیر بہت اچھی پکا لیتے ہوگے"

بندو پہلے تو تھوڑی دیر سر کھجایا کیا اور پھر کتاب اسطرح لیکر بیٹھ گیا کہ کتاب سے اس کا چہرہ چھپ گیا بابا مسکرا مسکرا کر اسے دیکھتا اور اپنا کام کرتا رہا ـــــ بڑی دیر بعد بندو بولا ـــــ

" بابا اب بہت جلد میں بہت امیر بن جاؤں گا اور سب سے پہلے کھانا پکانے کے لئے ایک نوکر رکھوں گا ـــــ "

" انشاء اللہ ـــــ بابا نے دل جمعی کے ساتھ کہا ـــــ

" ہاں ہاں انشاء اللہ کہنا میں بھول گیا تھا ـــــ

انشاء اللہ ـــــ انشاء اللہ ـــــ .... کچھ دیر رک کر وہ بولا ـــــ " مگر بابا ایک بات ہے ـــــ آپ نے بتایا تھا کہ انشاء اللہ کا مطلب ہے اللہ نے چاہا تو .... تو اگر کبھی اللہ میاں کا موڈ بدل گیا اور اُن کا دل چاہے ہی ناں ، تو پھر بن امیر کیسے بنیں گے بابا ـــــ ؟

بابا ہنس پڑا ـــــ بڑے پیار سے بولا ـــــ " ارے دیوانے اللہ میاں نے قرآن شریف میں وعدہ فرمایا ہے کہ " ہم محنت کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے "

یعنی جو محنت کریگا اس کا پھل اُسے ضرور دیں گے ، تو تو جو دن رات محنت کر رہا ہے تو کیا یہ یونہی رائیگاں چلی جائے گی ـــــ " ؟

اک دم بندو تیزی سے اُٹھا اور اوپر لکڑے کی پٹی پر رکھی ہوئی اپنی پوٹلی نکال کر بابا کے پاس آکر بیٹھ گیا ـــــ

" بابا دیکھئے اب تو کافی روپئے جمع ہو گئے ہیں ، کل ہی گن کر رکھے ہیں ـــــ پورے دو سو چودہ ہیں . اب اس سے ایک زوردار بزنس شروع کر دینا چاہیئے ـــــ "

" ہاں بیٹا میں بھی یہی کہنے والا تھا کہ سب سے اچھی روزی خود مختاری کی ـ بھلا کب تک دوسروں کے بوجھے ڈھوتا رہے گا ـ ایسا کر تو قسطوں پر ایک ہاتھ گاڑی خرید لے اور یہاں وہاں سے لوہے کا کچرا ، لکڑا ، ٹوٹا خرید کر ، اچھے داموں بیچنا شروع کر دے ـــــ "

بندو بڑا مان گیا ـــــ " ارے واہ بابا آپ نے بھی خوب بزنس بتایا ـــــ برسوں ہی میں

بنیا شرٹ اور نئی لنگی خریدی ہے، اِس نئے جوڑے کو پہن کر بھی میں ہاتھ گاڑی گھسیٹوں اور لوہے کا کچرا جمع کرتا پھروں ـــــ ؟"

"میاں ـــــ! بابا نے بیحد نرمی سے سمجھایا ـــــ کوئی بھی دھندہ حقیر نہیں ہوتا ـ مجھے دیکھو جوتے گانٹھتا ہوں ـــــ موچی بابا کہلاتا ہوں ـ اِس سے کیا میری ذات گھٹ گئی ....."

"بابا یہ خیال تو میرے دل میں بھی پہلے کئی بار آیا تھا ـــــ کہنے کی ہمت نہ پڑی کہ آپ کو جوتے گانٹھتے بُرا نہیں لگتا ـــــ ؟"

بابا نے سر اٹھا کر ترس بھری نظروں سے اُسے دیکھا ـ

"اچھا ہی ہے نا بیٹا، جوتے ہی تو گانٹھتا ہوں نا، لوگوں کے پیروں پر ہی نظر رہتی ہے نا ـــــ! ... کبھی پسند ہے، تم نے دیکھا ہوگا، ماتھا آنکھیں اور منہ تو اونچائی پر ہوتے ہیں مگر عقیدت کے اظہار کیلئے چھوا قدموں کو ہی جاتا ہے" بندو کچھ نہ بولا بڑی عقیدت مندانہ نظروں سے بابا کو دیکھے گیا ـــــ "اور بیٹا لوہے کا دھندہ کرنے کو اِس لئے بھی کہتا ہوں کہ خدا نے فرمایا ہے کہ ہم نے تمہارے لئے لوہے میں بہت سے فائدے رکھے ہیں" ـــــ

بندو ہنس کر بولا ـــــ "بابا آپ نے مجھے آدھا مسلمان تو کر ہی دیا ـــــ چلئے آپ کی یہ بات بھی مانے لیتے ہیں ـــــ"

یہ حقیقت ہے کہ خدا محنت کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے ـــــ میلی لنگی ـ پھٹے شرٹ میں دھاروں دھار پسینے میں ڈوبے ڈوبے ہاتھ گاڑی چلاتے ہوئے بندو نے ترقی کی ایک اور منزل سر کرلی ـــــ ایک جگہ بھنگار میں سستے داموں بہت سا لوہا مل گیا اُن دنوں لوہے کا بھاؤ نیچا چار ہا تھا ـــــ بابا نے ہی مشورہ دیا کہ جھونپڑے کے سامنے والی خالی زمین میں مال خرید خرید کر جمع کرتے جاؤ جب بھاؤ اونچا جائے تب نکال دینا ـــــ ایک ہی مہینے میں بندو کے پاس ہاتھ گاڑی سے تین پہیوں والا ٹیمپو آگیا ـــــ لنگی، پتلون سے بدل گئی

اور چہرے مہرے سے اسے دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کسی نیچ ذات کا آدمی ہے ــــ

بندو نے بابا کا ساتھ پھر بھی نہ چھوڑا ــــ

"بابا ــــ بمٹو میں بیٹھا ہوا میں کیسا لگتا ہوں ــــ"؟ اس دن بندو نے ذرا شرارت سے اکڑ کر بابا سے پوچھا ــــ

"میاں ــــ بس خدا کا شکر ادا کیا کرو ــــ وہ جسے چاہے عزت دے"۔

بندو بمٹو سے کود کر اترا بابا کے گلے سے بچوں کی طرح جھول گیا ــــ

"بابا دو تین سالوں کی محنت ہی میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ــــ بابا اب اپن ایک اچھا والا گھر لے لیں گے ــــ"

بابا نے ہاتھ اٹھا کر انکاری انداز میں سر ہلا دیا ــــ

"اپن نہیں ــــ تم ــــ"

"ارے واہ بابا ــــ بندو دولہا سا ہو گیا ۔ آپ کے بغیر نیا گھر تو کیا میں سورگ میں بھی نہ جاؤں"۔

بابا اسے پیار سے اپنے بازو میں بھلاتے ہوئے بولا ــــ

"دیکھ بیٹا ــــ میں بڈھا آدمی اسی کونے میں اللہ اللہ کرتا ٹھیک ہوں ــــ تو جوان آدمی ہے نیا گھر لے، چار دن کو اللہ ہو تڑ دیگا ۔ شادی کرنا، بال بچے ہوں گے ــــ بس یہیں سے تیرے لئے بیٹھے بیٹھے دعا کیا کروں گا ــــ"

"بابا میں نے کہہ دیا تھا آپ کے بغیر میں کہیں نہیں جاؤں گا ــــ"

بابا دور اشارہ کر کے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتا ہوا بولا ۔

"یہاں رہوں گا تو دل کو یہ تسلی رہے گی کہ اپنی سکینہ سے قریب ہوں ــــ وہ قبر میں سہی، مجھے لگتا ہے مجھ سے قریب ہے، ہر برے وقت میں دکھ میں آنسوؤں میں اس نے میرا ساتھ دیا ــــ بس زندگی بھر اولاد کے لئے ترستی رہی ــــ آج تو وہ بھی دیکھتی ہو گی کہ اللہ نے نہ صرف میری بلکہ اسکی بھی گود بھر دی ہے ــــ" اس نے زور سے بندو کو گلے سے لگا لیا ــــ

"اب آخری وقت میں اسے کیا چھوڑوں گا بیٹا ــــ ویسے میں تیرے پاس آتا جاتا تو رہوں

گاہی ــــ" وہ ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا ــــ

"بابا ــــ" بندو ڈرتے ڈرتے بولا ــــ" میں ماں کی قبر پر پھول .... پھر وہ اچانک چپ رہ گیا ــــ

"ہاں ہاں کیوں نہیں ــــ بابا آنسو پونچھ کر بولا ــــ اسمیں پوچھنے کی کیا بات ہے ....

"بابا ــــ وہ زور سے چیخ کر بابا سے لپٹ گیا ــــ میں آج آپ کے سامنے اپنی زندگی کا ہر ہر ورق کھول کر رکھ دوں گا ــــ آپ اتنے مہان ہیں اتنے عظیم ہیں کہ آپ سے کوئی بھی بات چھپانا گناہ ہو گا ــــ جرم ہو گا ــــ بابا ــــ بابا ــــ وہ ذرا شانت ہوکر بولا ــــ" میں ــــ میں اچھوت ہوں"!!

بابا نے اسے بے حد حیرت سے، بڑے اچنبھے سے دیکھا ــــ پھر سر ہلا کر بولا۔

"تو اس سے فرق کیا پڑتا ہے ــــ"؟

بندو پاگلوں کی طرح دونوں دونوں ہاتھ ہلا کر بولا ــــ

"تو بابا آپ کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ــــ کوئی فرق ہی نہیں پڑتا ــــ"؟ پھر وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا ــــ" ارے بابا آپ بالکل بھولے ہیں اس سے بہت فرق پڑجاتا ہے بابا ــــ جب کوئی انسان اچھوت بن کر پیدا ہوجاتا ہے نا بابا ــــ تو اسکے لئے مندر کے دروازے بند ہوجاتے ہیں ــــ کنویں کا پانی اس کے لیئے حرام ہوجاتا ہے ــــ چوری نہ بھی کرے تو اسکے پیروں میں موٹی موٹی زنجیریں باندھ دی جاتی ہیں ــــ اور بابا اور تو اور کمر سے جھاڑو باندھ دی جاتی ہے کہ پاک دھرتی پر ناپاک قدموں کے نشان پڑ بھی جائیں تو مٹتے جائیں ...... بابا حیرت سے بندو کو دیکھ رہا تھا جو ہانپے جا رہا تھا۔ مگر مسلسل بولے جا رہا تھا ــــ

"بابا آپ کو نہیں پتہ اچھوت کے ہاتھ کی چھوئی ہوئی ہر چیز نجس، ناپاک اور گندی ہوجاتی ہے ــــ لیکن بابا مزے کی بات یہ ہے کہ ہماری عورتوں کو ہماری ماؤں بہنوں کو چھونے سے وہ لوگ ناپاک نہیں ہوتے ....

بابا نے اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا ایک کٹورا اس کے منہ سے لگا دیا ــــ

پھر بندو نے اپنے ماضی کی ایک ایک چھوٹی سے چھوٹی واردات بابا کے سامنے کھول کر رکھ دی ___ بابا خاموش بیٹھا سنتا گیا ___ بیچ بیچ میں وہ بندو کو گلے لگا لیتا یا پیٹھ تھپکنے لگتا ___

جب دل کی پوری بھڑاس نکل چکی تو بندو پرسکون سا ہو کر بولا ___

"بابا میں سمجھ رہا تھا کہ یہ سب سُن کر اور یہ جان کر کہ میں ایک نیچ ذات سے ہوں آپ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے ___"

بابا مسکرایا ___ بڑی دانشمندانہ مسکراہٹ ___

پھر بولا ___ "بیٹا کوئی چھوٹا ہے نا بڑا ___ انسان کا اوّل بھی مٹی ہے آخر بھی مٹی ___ سب ایک طرح پیدا ہوئے ایک ہی طرح مریں گے ___ اسمیں بڑائی چھوٹائی کہاں سے آگئی؟

بندو کی نظروں میں بابا آکاش سے بھی اونچا ہو گیا ___

اس دن بندو بہت ہی خوش خوش باہر سے لوٹا اور آتے ہی بابا سے لپٹ کر بولا۔

"بابا بس آپ کا آشیرواد چاہیئے ۔ آج ایک ایسا آرڈر ملنے کی امید ہے کہ بس آر یا پار ___"

بابا مسکرایا ___ "وہ تو اللہ کے فضل سے تجھے مل ہی جائے گا ___ لیکن اب اسکے بعد سب سے پہلے کام تیری شادی ہو گی ___"

"شادی ___" بندو حیرت سے بولا ___ "وہ کیوں بابا"

"ارے میاں شادی ہو گی تو گھر بار ہو گا، بال بچے ہوں گے ___ یہی تو اصلی زندگی ہے"

اک دم بندو سنجیدہ ہو گیا ___ "نہیں بابا اصلی زندگی یہ نہیں ہے ۔ اصلی زندگی تو وہ ہو گی جب میں اپنی نیچ جاتی کو اوپر اٹھا سکوں گا ___ یہ میرا عہد ہے بابا ___ میرے منصوبے اور مقاصد کچھ اور ہیں، آپ نہیں سمجھیں گے ___"

"میں سب سمجھتا ہوں بیٹا اور مجھے خوشی بھی ہوتی ہے تمہیں اور تمہارے حوصلوں کو دیکھ کر ۔ اصل میں جب بھی دنیا میں جہالت اور ظلم کا گھور اندھیرا چھایا ہے، تم سا کوئی نہ کوئی جیالا مشعل لے کر

اٹھ کھڑا ہوا ہے ـــــ مہاتما گاندھی کی مثال ہی لے لیجئے سامنے ہے ـــــ "

"بابا آپ جیسی مہان ہستی مہاتما گاندھی کا نام لے بھی سکتی ہے۔ میں تو اتنا حقیر اور چھوٹا ہوں کہ اپنی زبان سے یہ نام ادا کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا ـــــ ہاں آپ کے چرن چھو کر یہ عہد ضرور کر سکتا ہوں کہ باپو نے جو مشعل جلائی تھی میں اسے بجھنے نہیں دوں گا ـــــ "

بابا اُسے محبت سے دیکھے جا رہا تھا ـــــ " بابا میرے دل میں بدلہ لینے کی کوئی تمنا نہیں بدلہ تو کم ظرف لیا کرتے ہیں ـــــ میں ایک ہی بات چاہتا ہوں کہ سماج کی برابری اور اونچ نیچ کا جھگڑا ختم ہو جائے اسکے لیئے بابا ـــــ میں نے بھی ایک نعرہ ایجاد کیا ہے کہ غریبوں کو اتنا امیر کر دو کہ امیر اُن کے سامنے غریب نظر آنے لگیں ـــــ " بابا مسکرانے لگا ـــــ " ہاں بابا میں نے دیکھا ہے اور اپنے حسابوں یہی سمجھ سکا ہوں کہ دُنیا میں سارے جھگڑے دراصل غریبی کے پیدا کردہ ہیں ـــــ بابا آپ کو نہیں پتہ خاص طور سے چھوٹے دیہاتوں میں ہم غریب اچھوت کیطرح دھتکار جاتے ہیں ـــــ کیسے کیسے ہمارا دل جلتا ہے کیسی کیسی آہیں ہمارے دلوں سے نکلتی ہیں ......

" بیٹا ـــــ جسطرح چھوٹا بچّہ بھوک سے تڑپے تو ماں کی چھاتیوں میں دودھ آپی آپ جوش مارنے لگتا ہے اسی طرح مظلوم کی آہ خداوند تعالیٰ کی محبت کو جوش دلا دیتی ہے ـــــ تڑپ اور آہ میں اثر ہو ... تو عرش اعظم کے پائے ہل جاتے ہیں ـــــ مجھے خدا سے یقین ہے میاں کہ تمھاری کوششیں خدا کے یہاں ضرور قبولیت کا درجہ پائیں گی ـــــ تم نے دیکھا ہو گا چمڑے کی دھونکنی لوہے تک کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے ـــــ

ایک عالیشان بنگلے کا آج افتتاح تھا ـــــ جھلمل جھلمل قمقمے یہاں سے وہاں تک جگمگا رہے تھے ـــــ سامنے کی دیوار پر بڑی سی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی جس پر " دھرم راج اسٹیل اینڈ آئرن ڈیلر " کا خوبصورت نام جھم جھما رہا تھا ـــــ مہمانوں کے بھیڑ بھڑکے میں کئی گاڑیوں کو پس پشت ڈالتی ایک لمبی سی گاڑی پھاٹک کے اندر داخل ہوئی ـــــ

"دھرم راج جی آگئے"۔۔۔

"دھرم راج جی آگئے"۔۔۔

لوگ آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے۔۔۔

کھٹاک سے گاڑی کا دروازہ کھول کر بندو اُترا۔۔۔ ایک شاندار اور عظیم الشان شخصیت۔۔۔" اس نے تیزی سے اُتر کر دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔۔۔

"آئیے بابا۔۔۔ اس گھر کا افتتاح آپ کو کرنا ہے۔ آپ ہی کے شبھ قدم سب سے پہلے اس گھر کی دہلیز کو چھوئیں گے"۔۔۔

ناں۔۔۔ ناں کرتا بابا اُترا۔۔۔ اسکے پیچھے بندو اور لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ۔ بابا نے ربن کاٹی اور دُعا کی۔۔۔" خداوندا اس گھر کو سدا بھرا پُرا رکھنا اور اس گھر کے مکینوں کو ہمیشہ نیکی اور بھلائی کے راستے پر چلانا"۔۔۔ باہر آتشبازی چھوٹنے لگی اور متعدد نوکر مٹھائیوں اور مشروبات کے تھال اِدھر سے اُدھر کرنے لگے۔۔۔

نوخیز اور حسین لڑکیاں جان بوجھ کر دھرم راج کے سامنے آنے لگیں۔۔۔

بابا کے جھونپڑے کے سامنے لمبی سی گاڑی کھڑی ہوئی تھی اندر بندو بابا سے اُلجھ رہا تھا۔۔۔

"بابا آپ نے کہا تھا کہ آتے جاتے رہا کریں گے، دیکھئے آپ اپنا وعدہ نہیں نبھا رہے ہیں"۔۔۔

"تو تو نبھا رہا ہے نا"۔۔۔!

"ہاں بابا وہ تو میں انشاء اللہ زندگی بھر نبھاتا رہوں گا۔۔۔ جسطرح آپ پانچ وقت کی نماز یہ کہہ کر پڑھتے ہیں نا کہ یہ فرض ہے جو ٹالا نہیں جاسکتا، اسی طرح میرا روزانہ آپ کے

ہاں آکر ایک بار آپ کے درشن کر لینا بھی فرض ٹھہرا ـــــ یہی میری عبادت ہے ــــ"

بابا ایک جوتے میں کیل ٹھونکتے ہوئے مسکرایا اور ہتھوڑی زمین پر رکھ کر بولا۔
"میری محبت تو اتنی کرتا ہے بات نہیں مانتا ـــــ شادی کر لینے سے کیا تیرے کام کاج رک جائیں گے ـــــ بلکہ دل جما رہے گا تو اور اچھی طرح کام ہوں گے ــــ"

بندو کچھ فکر مند سا نظر آتا تھا ـــــ "نہیں بابا ابھی فی الحال تو اس پروگرام کو اٹھا ہی رکھئے ـــــ مجھے ایک الگ ہی سوچ کھائے جا رہی ہے ــــ"

"وہ کیا ـــــ"؟ بابا بھی فکر مند ہو گیا ـــــ

بندو زمین پر اطمینان سے بیٹھ گیا ــــ" بابا دراصل بات یہ ہے کہ مجھے ہر لمحہ یہ ڈر سا لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی میری اصلیت کو پہچان نہ لے ـــــ آج کل تو طرح طرح کے بزنس والے ـــــ اخبار والے ملنے آتے رہتے ہیں ـــــ اکثر میری زندگی، میرے ماضی میری جدوجہد اور اس کامیابی کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں ـــــ ابھی تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا ہے بابا ـــــ اگر ادھر بیچ میں لوگوں کو پتہ چل گیا کہ میں دراصل ایک نیچ ذات کا اچھوت ہوں تو آپ جانیں بابا عوام کی طاقت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا ـــــ میں اکیلا پس جاؤں گا اتنی بڑی طاقت کا مقابلہ نہ کر پاؤں گا ......

بابا بھی کچھ پریشان سا ہو گیا ــــ" اور بابا آپ جانتے ہیں دشمنوں اور بہکانے والوں کی اور بہک جانے والوں کی کسی بھی زمانے میں کمی نہیں رہی ہے ــــ"

"میں اچھی طرح تمہارا مطلب نہیں سمجھا میاں ــــ" بابا سر ہلا کر بولا ـــــ
"دیکھئے نا بابا یوں دروازہ بند رہے تو کوئی دستک نہیں دیتا لیکن ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے کوئی بھی سر اندر ڈال کر جھانک لیتا ہے ـــــ مجھے لگتا ہے اور غلط نہیں لگتا کہ میری زندگی میں کہیں نہ کہیں ایسا جھول ضرور ہے کہ لوگ انگلی اٹھا سکیں ـــــ اسی لئے میں تنہا رہنا چاہتا ہوں تاوقتیکہ میں کوئی ٹھوس کام نہ کر لوں۔ میں اپنے راز کا سوائے آپ کے زندگی میں

کسی کو شریک نہیں بنا سکتا ۔۔۔" پھر وہ کچھ رُک کر بولا ۔

"کل میں ویسے گاؤں جا رہا ہوں"۔۔۔ بابا نے چونک کر اُسے دیکھا ۔۔۔

"ہاں بابا ۔۔۔ چودہ برس بہت طویل مدّت ہے ۔۔۔ رام کی طرح میں نے بھی ایک پورا بن باس جھیلا ہے ۔۔۔ میں چاہتا ہوں ذرا جا کر دیکھوں تو ہی کہ کیا وہاں کی پوتر دھرتی پہ پڑنے والے ناپاک نقوش کو مٹانے کے لیئے آج بھی سر سے جھاڑو باندھی جاتی ہے ؟ کیا ابھی تک پتّیوں کے پیر پڑھے ...... وہ اچانک چپ رہ گیا ۔۔۔

اسکی آنسوؤں سے بھری آنکھیں دیکھ کر بابا کا اپنا جی بھی پگھل گیا ۔۔۔ وہ ذرا سنبھل کر بولا ۔۔۔

"لیکن بابا میں اس سوٹ پینٹ ٹائی اور گاڑی میں نہیں جاؤں گا ۔۔۔ میں ایک اچھوت کی طرح ہی جاؤں گا تاکہ اس مٹی سے اپنا رشتہ یاد کر سکوں ۔۔۔"

بڑا سا پگڑ جس سے آدھا چہرہ بھی ڈھک گیا تھا ، دھوتی کرتا اور بکڑ سی چپل ۔۔۔ اپنے گاؤں کو جانے کے لیئے بندو نے وہ راستہ چُنا تھا جو ۴ - ۶ کوس پہلے ہی سے ہریجن بستی سے نکلتا تھا ۔۔۔ اس گاؤں کا نام چندا پور تھا ، جو اس کے اپنے سونا گاؤں سے بہت پہلے پڑتا تھا ۔۔۔

"سنتے ہیں دلتوں میں بہت سُدھار ہو رہے ہیں ذرا دوسری ہریجن بستیوں کو بھی دیکھتے چلیں" ۔۔۔ اس نے پگڑی سر پر جماتے ہوئے اپنے آپ کو سُنایا ۔۔۔

تھوڑی دیر بس سے اتر کر وہ پیدل چلا گیا ۔۔۔ مزے مزے میں کھیتوں کی ہوا اور مناظر کے درشن کرتا ہوا ۔۔۔ پھر اس کا دل ٹوٹنے لگا ۔۔۔ وہی مخصوص چہرے ۔۔۔ وہی شیشوں کی نوک کی طرح دل میں چبھ جانے والی یادیں ۔۔۔ وہی کھیتوں میں

کام کرتے ہوئے اچھوت ــــ گوبر تھاپتی، اُپلے سمیٹتی اُن کی عورتیں ــــ ننگ دھڑنگ بچے ــــ زمین داروں کے کارندے ہاتھ میں سونٹے اُٹھائے عورتوں کو تاکتے، بظاہر اُن کے کاموں کی نگرانی پر مامور مگر اُن کے جسموں کو ٹٹولتے ہوئے ــــ کہیں کہیں روٹی کھاتے ہوئے بربتی کیسان ــــ جن کے خشک حلق سے سوکھی روٹی اور پیاز اُترتی نہ تھی اور جو ہر نوالے کو پانی کے گھونٹ سے اندر ڈھکیل دیتے تھے ــــ

اے ہندوستان !

اے میرے جنت نشان ......!

اُس نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی مطلق کوشش نہ کی ــــ

ڈھم . ڈھم . ڈھم . کہیں دور ڈھول پٹ رہا تھا ــــ کسی کی حسب دستور نیلامی اُٹھ رہی ہوگی ۔ وہ تلخی سے دل ہی دل میں ہنسا ــــ چند برتن ــــ چند بیوی کے چاندی کے تار ــــ یہ کچھ فاقہ زدہ بچوں کے منہ سے چرایا ہوا اناج کہ وقت پر اُن ہی کا دوزخ بھرا جاسکے ــــ اُٹھاؤ بولی ــــ اُٹھاؤ ......

سامنے نظر اٹھائی تو ڈھم ڈھم کی آوازوں کے ساتھ مجمع بھی بڑھتا ہی جا رہا تھا ــــ اُس نے اُدھر سے نگاہیں ہٹالیں اور اپنے دل کو سمجھایا ــــ

"کیوں پرانی باتیں یاد دلا رہے ہو بھائی ــــ آنکھوں کا ایک مصرف دیکھنا بھی ہے صرف رونا ہی نہیں ــــ"

وہ ایک جھاڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ــــ اُسی کی ذات کا ایک آدمی اسکے قریب سے گذرا ــــ

"مسافر ہو ــــ؟"

اس نے سر ہلا دیا ــــ

"کس گاؤں کے ــــ"؟

"سارے گاؤں ایک جیسے ہوتے ہیں ۔ کہیں کا بھی سمجھ لو"

"کھانا کھاؤ گے ——؟ ایک روٹی ہے آدھی آدھی کر لیں گے ——"

"روٹی کے ٹکڑے مت کرو اس محبت سے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے بھائی" اس نے کہنا چاہا مگر آنسو گلے میں پھندہ بنے بیٹھے تھے۔

اُس نے بمشکل انکار میں سر ہلا دیا ——

"تو پھر پانی ہی پی لو —— تھکے ہارے لگتے ہو ——"

"ہم سب تھکے ہارے ہیں —— اپنی اپنی منزلوں سے بھٹکے ہوئے —— کون جانے کہ منزل ملے گی بھی یا نہیں ——"

اُس نے پانی کا لوٹا لے کر چند چھینٹے منہ پر مارے۔ ایک دو گھونٹ پئے اور آگے بڑھ گیا —— اُسکے دل دماغ اور رُوح میں ایک آگ سی بھر گئی تھی ——

"کون کہتا ہے دِن بدل گئے ہیں ——؟ یہ دن کبھی نہیں بدلیں گے —— کبھی نہیں، جب تک کہ ہم خود اس آگ میں نہ کود پڑیں ....

"اے سُن" —— اچانک ایک آواز نے اُسے چونکا دیا —— اُس نے مڑ کر دیکھا —— اور دیکھتے ہی حیرت زدہ سا رہ گیا —— زمیندار صاحب کا بڑا بیٹا!!

یہ گاؤں تو چندا پور تھا —— یہاں اُس کا کیا کام؟ وہ تو سونا پور کا جاگیردار تھا! چھوٹے زمیندار نے اُسے نہیں پہچانا، لیکن وہ پہچان گیا تھا —— سن سن کرتا خون اسکے چہرے پر چھلک آیا —— گھوڑے پر بیٹھا ہوا چھوٹا زمیندار اُسے اسطرح کھڑا دیکھ کر غصّہ سے بولا ——

"سُنتا نہیں —— بہرا ہے کیا —— میں نے تجھے بُلایا ہے"۔

بندو دھیرے دھیرے غصّہ کو ضبط کرتا آگے بڑھا، اور گھوڑے کے قریب جا کر زمیندار کو دیکھتا ہوا کھڑا ہو گیا ——

"یہ چابک میرے ہاتھ سے گر گیا ہے ذرا اُٹھا کر دے تو ——"!

بندو ذرا ٹیڑھے لہجے میں بولا ۔۔۔ "گھوڑے سے چڑھنا آتا ہے تو اُترنا بھی آتا ہی ہوگا ۔۔۔ خود اُتر کر کیوں نہیں اُٹھا لیتے ۔۔۔"

زمیندار نے عجیب سی نظروں سے دیکھا، جس میں غصّے سے زیادہ حیرت تھی! پھر ذرا دانت پیس کر بولا ۔۔۔

"تو اچھوت نہیں ہے ۔۔۔؟"

بندو تلخی سے مسکرا کر بولا ۔۔۔ تو اچھوت ہونے کا مطلب یہ ہُوا کہ تمھارا ہر حکم مان لیا جائے ۔۔۔؟ میں تمھارا چابک کس خوشی میں اُٹھا کر دوں؟"

زمیندار نے اِدھر اُدھر سر گھما کر دیکھا ۔۔۔ کوئی قریب میں نظر نہ آیا ۔۔۔ وہ تلملا کر بولا ۔۔۔

"حرام زادے زمین کے کیڑے ۔۔۔ تجھے پتہ ہے ہم کون ہیں ۔۔۔؟

بندو غصّہ دلانے کے انداز میں ہنس کر بولا ۔۔۔

"سونا پور کے چھوٹے جاگیردار! جو اس وقت گھوڑے پر بیٹھے ہیں ۔۔۔ لیکن بڑی عجیب بات ہے کہ بلندی پر، گھوڑے پر سوار ہونے کے باوجود تم مجھ سے سر جھکا کر بات کر رہے ہو اور میں زمین پر ہو کر بھی سر اُٹھا کر تمھاری بات کا جواب دے رہا ہوں ۔۔۔"!

چھوٹے زمیندار نے غصّہ سے پھن پھنا کر دیکھا، واقعی گھوڑے پر بیٹھنے کے باوجود بات کرنے میں اُسے سر نیچا کرنا پڑتا تھا جبکہ وہ اچھوت نیچ ذات کا آدمی سر اُٹھائے اس سے زبان لڑا رہا تھا ۔۔۔ زمیندار گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اتنی زور سے تڑپا کہ گھوڑا بھی پیر پٹخ پٹخ کر اپنی بے چینی کا اظہار کرے گا ۔۔۔

"ارے کوئی ہے ۔۔۔" وہ اوپر بیٹھے ہی بیٹھے زور سے چلّایا ۔۔۔

"بچے ۔۔۔ بہادر ہو تو دوسروں کو پکارنے کی تکلیف مت کرو ۔۔۔ ایک کو ایک بہت کافی ہوتا ہے ۔۔۔ ویسے بھی ہمیں کوئی پہلوانی تو کرنی ہے نہیں ۔۔۔ بس ذرا ہاتھ پاؤں کھولنے ہیں ۔۔۔"

گھوڑے کی اِس اُچھال سے، زمیندار نیچے اُتر آیا، اب وہ صبر و ضبط کی منزلوں سے گذر چکا تھا۔ نیچے پڑا چابک اب بھی اسکی غیرت کو للکار رہا تھا۔

"اب بھی وقت ہے۔ چابک اٹھا کر دے دے"

"سُنو زمیندار ـــ معمولی سی بات ہے، چابک اٹھانے کے لیئے جھکنا بھی پڑتا ہے۔ اور میں زندگی میں کسی انسان کے آگے نہیں جھکوں گا ـــ" وہ بڑی بے خوفی سے زمیندار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ بات کہہ رہا تھا۔!

"تو کیا یہ حقیر سر مندر میں بھگوان کے آگے جھکے گا ـــ"؟ زمیندار تلخی سے ہنس کر بولا۔ کیونکہ مندروں میں اچھوتوں کا داخلہ منع تھا ـــ پھر اچانک ہی وہ تیزی سے جھپٹ کر اسکی گردن پکڑ کر دباتے ہوئے بولا ـــ

"ارے! سالے یہ دو انگلی کی گردن تو ایک جھٹکے کے بھی قابل نہیں ـــ" لیکن زمیندار کا اندازہ غلط تھا ـــ چوبیس سالوں سے جمع ہوتی ہوئی کڑواہٹ اب ایک ایسا شکنجہ بن گئی تھی کہ بڑی سے بڑی چٹان کو بھی پیس کر رکھ دیتی ـــ بندو نے ایک جھٹکا دے کر اسطرح اپنی گردن چھڑائی مانو زمیندار کے ہاتھوں میں کوئی چپڑا ہو جس کی چکناہٹ سے وہ پھسل پڑا ہو ـــ

اب زمیندار نے تلملا کر چابک اٹھایا کر بندو پر دے مارے ـــ بندو نے اُسے درتا کر دلادیا ـــ

"ہاں یہ ہوئی نہ شرافت کی بات ـــ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کیا کرو بچے، اسطرح صحت اچھی رہتی ہے"

"صحت کے بچے تیری کھال نہ ادھیڑ دی ہو تو یاد رکھنا ـــ"

اُٹھے ہوئے چابک کی سونٹی پکڑ کر بندو نے اتنی زور سے اپنی طرف کھینچی کہ زمیندار بھی ساتھ ہی لڑھکتا چلا آیا ـــ شہر میں بوجھ ڈھونے ہاتھ گاڑی بھر بھر وزن کھینچے اور

محنت مشقت کرنے سے بندو کے ہاتھ پاؤں ایسے مضبوط نکل آئے تھے کہ جو بھی دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا ـــــ

زمیندار اپنی جاگیر اور نوکروں کے بل بوتے پر بڑا ضرور تھا مگر طاقت میں بندو کا مقابلہ کہاں کر پاتا ـــــ اوپر سے بندو اسے جلائے جا رہا تھا ـــــ اسے کتّے کی طرح پچکارتا ہوا بولا ـــــ

"پُچ ـ پُچ ـــــ اچھے بچے یوں مٹی میں لوٹ کر اپنے کپڑے خراب نہیں کیا کرتے ـــــ جاؤ گھر جاؤ ـــــ نہیں تو ماں مارے گی"

اسکے بعد گھونسوں، لاتوں اور مکّوں کا وہ زور دار تبادلہ شروع ہوا کہ گرد و غبار میں دونوں اٹ گئے ـــــ دور سے کسی نے یہ تماشہ دیکھا اور اسکے چیخ پکار کرنے پر ایک ایک کر کے کئی لوگ جمع ہوئے اور قریب آگئے ـــــ

سب دم سادھے دو شیروں کی لڑائی دیکھ رہے تھے، جن میں سے کوئی بھی ہار ماننے پر تیار نہ تھا، دیکھنے والوں میں اکثریت اچھوتوں اور غریبوں کی تھی، جن کے چہرے زبان حال سے چیتھڑوں میں لپٹے اور غریبی کی تصویر بنے بندو کی جیت کی دعائیں کر رہے تھے ـــــ زمین دار کا ایک گھونسہ بندو کے منہ پر پڑتا تو کئی لوگوں کے منہ سے اُف رے آہ کی آوازیں نکل جاتیں اور بندو کی لاتیں زمیندار پر پڑتیں تو گو خوف کے مارے وہ کچھ بول نہ سکتے، مگر چہرے کھل اٹھتے ـــــ اور شاید اس دن قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ چہرے کھلے رہیں کہ ایک زور دار گھونسے سے زمیندار بے ہوش ہو کر خاک پر گر پڑا۔

بندو نے ہانپتے ہوئے آس پاس کھڑے لوگوں کو مخاطب کیا ـــــ

"سالے کو گھوڑے پر ڈال دو ـــــ گھوڑا وفادار جانور ہوتا ہے گھر پہونچا دے گا"

"مگر بھیا ـــــ کچھ لوگ آگے بڑھے ـــــ تم نے غضب کر دیا ـــــ اب تمہاری خیر نہیں۔ تمہیں پتہ نہیں وہ سونا گاؤں کا چھوٹا ٹھاکر ہے"

"تو یہاں کیا کرنے آیا تھا" ؟ بندو نے غصّہ سے پوچھا ـــــ

یہاں کی جنّیات بھی خریدنا چاہتا ہے۔ ایک سودا پکا کرکے جا رہا تھا ـــــ اور بھی جمین لینے والا ہے ......

"حالانکہ انسان کو صرف چھ ہات کی زمین بہت کافی ہوتی ہے ـــــ" بندو اپنی رو میں کہہ گیا۔"

"بھائی تم اس گاؤں کے تو نہیں لگتے ـــــ" اسکی بہادری سے مرعوب ہو کر ایک عورت بولی ــ

"ہاں بہن ٹھیک سمجھیں تم ـــــ میں اس گاؤں کا نہیں لگتا ـــ پھر بھی یہ گاؤں میرا بہت کچھ لگتا ہے۔ یہی گاؤں نہیں ـــ ہر گاؤں سے میرا ناطہ ہے ـــــ میرا ہی نہیں ـــ ہم سبھی کا ـــ اور میں وہی رشتہ دوبارہ سے زندہ کرنے آیا ہوں"

آس پاس کھڑے سب لوگ اسے اس عقیدت سے دیکھ رہے تھے مانو وہ کوئی دیوتا ہو ـــــ

اتنے میں ایک عورت لوٹا بھر پانی اور ایک تھالی میں روکھا سوکھا کچھ کھانا لے آئی اور بڑے پیار سے بولی ـــ

"لو بھائی ـــ تھوڑا کھا کر ذرا آرام کر لو ـــ آج تو تم نے جیسے کہانیوں کی بات سچ کر دکھائی جن میں کوئی بانکا چھبیلا، راکشش کو اپنی ایڑی سے مسل دیتا ہے ـــ"

"ملنے کا تو ٹائم تو اب آئیگا میری بہن ـــ" بندو ایک پیر زور دے کر ہاتھ منہ دھوتے دھوتے بولا ـــ

"کھالی برتن میں ایک حد تک ہی پانی سما سکتا ہے۔ بعد میں تو چھلکے گا ہی ـــ"

"دیکھو سب لوگ مارے خوشی کے کیسے ناچ رہے ہیں کہ آج تم نے جمیندار کی ٹھکائی کر دی" ایک آدمی نے چند بچوں، عورتوں اور مردوں کی طرف اشارہ کیا جو مارے خوشی کے ہاتھ ناچنے گانے لگے تھے ـــــ

بندو کا دل ایک عجیب سی امید اور خوشی سے بھر سا گیا ـــــ

کئی لوگوں نے اُس سے اصرار کیا کہ ہمارے گھر چلیں مگر وہ وہیں ایک پیڑ کے کنارے لیٹ گیا اور پتہ نہیں دل پر سے کیسا بوجھ سا ہٹ گیا تھا کہ اسے وہیں پڑے پڑے نیند لگ گئی ــــــ

پتہ نہیں کتنا وقت گذر گیا تھا ــــ گھوڑوں کے ہنہنانے، بیل گاڑیوں کی کھچ کھچ، جانوروں کی گھنٹیوں سے اسکی آنکھ کھُل گئی، مگر وہ غلط سمجھا، اسکی آنکھ دراصل نیلامی بولنے والے کی تیز آواز سے کھُلی تھی جو چلّا چلّا کر لوگوں کو ترغیب دلا رہا تھا ــ

"دیکھو لوگو دیکھو ــــ کیا بڑھیا مال ہے ــ ہاں ہاں ایک ایک کپڑا اُتار کر دکھاؤں گا۔ تبھی دام لگانا۔ ہاں تو کس نے کہا تھا ایک سو ایک ــ ایک سو ایک ۔ دیکھو اب اِدھر بھگوان کی کاریگری کا کمال !

پھر سے اس نے لڑکی کا بلاوز پھاڑا ــ دیکھو ۔ ذرا غور سے دیکھو کیسا چاندی سا بدن ہے ــ ایسے بدن کے تو...... ہاں تو کس نے کہا تھا ایک سو پچاس ایک ــــ ایک سو پچاس دو ــــ دیکھو اُدھر کسی دل والے نے دو سو کی بولی دے دی ہے ــــ

ابھی ایک کپڑا اور باقی ہے، وہ بھی اُتر جائے گا تو پھر دیکھنا کیا حال ہے۔ مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسل پھسل پڑتی ہے سالی ــ اب دیکھو اگر دیکھنے کی طاقت ہو پھر دام لگانے میں کنجوسی مت کرنا بھائی لوگو ــــ

نبد پیچ و تاب کھاتا آگے بڑھا ...... ذلیل ندیدی بھوکی نظریں جوان لڑکی کے جسم کو چھیدے ڈال رہی تھیں ــــ گھاگرے کے اوپر سے وہ آدھی برہنہ ہو چکی تھی ــــ اور نیلامی بولنے والا لوگوں کو اُکسائے جا رہا تھا کہ وہ اُسے پوری برہنہ کھڑے ہونے کے بجائے گا کہ بولی اونچی لگے ..... گھوڑے اپنے مالکوں کی بے تابی دیکھ کر ہنہنا رہے تھے ــــ گاڑی بان بلا ضرورت بیلوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے ــــ ماحول میں بیک وقت شور بھی تھا اور سناٹے کا تناؤ بھی ــ

لڑکی دونوں ہاتھوں سے اپنا جسم چھپانے کی کوشش کرتی اور نیلامی پھر اُسے لوگوں کے سامنے ڈھکیل دیتا کہ جی بھر کر دیکھ لیں ــــ

"ہم اس چھوکریا کو خرید یں گے" بندو پیچ و تاب کھاتا آگے بڑھا اور اپنے تلفظ کو جان بوجھ کر توڑ مروڑ کر بولا ___ مگر پہلے خوب اچھی طرح دیکھ کر کہ مال کچا نہ نکلے "

نیلامی لینے اور بیک وقت کئی لوگوں نے حیرت سے مڑ کر بندو کو دیکھا ___ پھر جلدی سے نیلامی بولا ___

"دیکھ لو ساہو ___ پر صورت سے لگتا تو نہیں کہ خرید سکو گے "

سارے موجود لوگوں نے زور کا ٹھٹھا مارا ___

بندو نے گھور کر ___ سب کو دیکھا ___ اور دھیرے دھیرے لڑکی کی پیٹھ پہ ہاتھ دھر کر اُسے ایک طرف لے گیا جہاں ایک طرح دار گھوڑا کنوتیاں بدل رہا تھا مانو کسی خوب رو کو سواری کی پیشکش کر رہا ہو ___

تیر کی سی تیزی سے اس نے لڑکی گھوڑے پر چڑھایا اور اسی تیزی سے خود بھی چڑھا اور باگیں سنبھال کر بولا ___

"اب جس کسی نے اپنی ماں کا اصلی دودھ پیا ہے وہ ہمارا پیچھا کرے، گھاسلیٹ پینے والوں سے ہماری کوئی شرط نہیں "

اور اس تیزی سے اس نے گھوڑا دوڑایا ہے کہ پہلے تو کوئی کچھ سمجھا ہی نہیں کہ کیا ہو گیا، پھر ہوش ٹھکانے آئے تو سب سے پہلے گھوڑے والا چلایا "ارے میرا گھوڑا ___" اور ساتھ ہی کئی اور دوسرے بھی جاگے اور کئی لوگوں نے پھر اپنے اپنے گھوڑے پیچھے ڈال دیئے.

اچانک بندو نے خود میں ایک ایسی بشاشت اور توانائی محسوس کی جو اتنی زندگی میں اس نے خود میں کبھی محسوس نہ کی تھی ___ گھوڑوں کی پیچھے آتی ہوئی ٹاپوں کو سن کر وہ بڑے ہلکے پھلکے اور پُر مزاح لہجے میں لڑکی سے بولا ___

"اب تم دیکھنا چھوکریا ہم ان بدمعاشوں کو کیسا چکمہ دیں گے"۔

اور واقعی اس نے ایک عجیب و غریب حرکت کی کہ پیچھے سے کئی گھوڑ سوار اسکے تعاقب میں انتہائی تیزی سے اسکے قریب آگئے تو اس نے اچانک اپنے گھوڑے کو روک لیا ۔۔۔ سارے گھوڑ سوار اپنی ہی رو میں خوب دور تیز نکلے چلے گئے اور بندو مخالف سمت میں تیزی سے دوڑ پڑا۔۔۔

یہ آنکھ مچولی بڑی دیر تک چلتی رہی اور آخر میں بندو نے گھوڑے کو اتنا تیز دوڑایا کہ پھر کسی خطرے کی گنجائش نہ رہی اور وہ دھیرے دھیرے دلکی چال پر گھوڑے کو ڈال کر سکون سا محسوس کرنے لگا۔۔۔

اس وقت تک دھوپ اُتر چکی تھیں ۔۔۔ ماحول میں ایک خوشگوار خنکی رچنی شروع ہوگئی تھی ۔۔۔ کھیتوں سے پیاری پیاری ہوائیں اپنے ساتھ مدھ ماتی خوشبوئیں لیئے چلی آرہی تھیں ۔۔۔ ایسے ماحول میں اچانک بندو بے حد بشاش ہو اُٹھا ۔۔۔ اور اسے خود حیرت تھی کہ وہ جو زندگی بھر ہونٹوں کو سیئے رہا آج یوں ہنسنے پر خود کو مجبور کیوں پا رہا تھا۔۔۔

"مزا آگیا نا"۔۔۔ وہ خواہ مخواہ مذاق کے موڈ میں آگیا تھا۔۔۔

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔ بڑی دیر بعد جیسے وہ اپنے آپ کو حالات کی شدت میں ڈھال سکی ۔۔۔ پھر بولی ۔۔۔

"آپ بہت اچھے ہیں"۔۔۔

"ہاں"۔۔۔ وہ ہاں کو لمبا کرکے بولا۔۔۔ "اچھے تو ہم بہت سوں کو لگتے ہوں گے پر ہم کو بھی تو کوئی اچھا لگے"۔۔۔ اس پر لڑکی نے اچانک اسے پلٹ کر دیکھا اور وہ یکبارگی ششدر سا رہ گیا۔۔۔

"خوبصورت تو واقعی تم اتنی ہو کے دو ہزار میں بھی بکتی تو کم تھا"۔۔۔

لڑکی نے پھر سے پلٹ کر اسے دیکھا۔۔۔ اب کی بار اسکے چہرے پر ذرا غصہ تھا۔

"مگر یہ چکر کیا تھا نیلامی کا"۔۔۔ وہ اسکے کان میں جھک کر بولا۔۔۔

لڑکی ذرا آزردہ ہوگئی بولی ــــ "بے سہارا عورت راستے میں پڑا سکہ ہوتی ہے جسے کوئی بھی راہ چلتا جیب میں اُٹھا کر ڈال لیتا ہے ــــ"

بندو آنکھیں سٹ پٹا کر بولا ــــ

"انگریجی تو بہت بڑھیا بول لیتی ہو ــــ"

"انگریزی ــــ؟ وہ عجیب سے لہجے میں بولی ــــ" جو اپنی ہی زبان سے بات کرنے کو ترستا ہو وہ دوسروں کی زبان میں کیا بات کرے گا بھلا ــــ"

"اب تو تم اور بھی بڑھیا انگریجی بول گئی ہو ــــ واہ ــــ"

"پتہ نہیں کس مسخرے سے پالا پڑ گیا ہے ــ لڑکی نے جھلا کر سوچا ــــ لیکن اس کا ذرا بھی سنجیدگی سے اس پر غصہ ہونے کو نہ چاہا ــــ اتنے ساردل کے مجمع سے یوں بہادری سے نکال لایا ــــ بیٹھتے ہی اپنا پگڑ حوالے کر دیا کہ اپنا جسم ڈھانک لو ــــ اب اتنی شرافت سے لئے جا رہا ہے ــــ کیا ہوا اگر مزاج میں ذرا دل لگی کرنے کی عادت ہے ــــ اچانک بندو نے پوچھا ــــ

"بھوک لگی ہے ــــ؟ لگی تو ہو گی ــــ ہمیں بھی لگی ہے"۔ پھر کھیتوں میں اِدھر اُدھر نظر ڈال کر بولا ــــ مگر ہم کچھ لائیں گے تو ہمارے ہاتھ کا کھا لو گی نا ــــ؟"

لڑکی نے ذرا حیرت سے اُسے دیکھ کر پوچھا "آپ؟

آپ کون ــــ ہیں ــــ؟ لڑکی کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ اپنے آپ سے بولا ــــ" میاں دھرم راج! آپ گئے کام سے ....

پھر وہ بے حد لاپروائی سے آسمان کی طرف خوب اونچا ہاتھ کر کے بولا ــــ" ہم۔ ہم تو بھیا بہت، بہوت اُنچی جات کے براہمن ہیں ــــ" پھر ذرا غم سے ــــ" مگر جرا گریب ہیں۔"

آپ۔ آپ برہمن ہیں ــــ؟ وہ اک دم چلتے گھوڑے پر سے کود پڑی ــــ آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں ــــ آپ کے برابر تو بیٹھنا بھی پاپ ہے ــــ"

"دیکھو چھو کر دیا ــــ وہ ہاتھ ہلا کر بولا ــــ ہم نہ تو عورت ہیں جو تمہاری مائی بن سکیں

اور نہ تو ...... ہم تمہارے باپ بننا چاہتے ہیں کیونکہ ہمارے دل میں تمہاری اور سے گھوڑ باپ آگیا ہے ــــ اور جب کسی کے دل میں کسی کی طرف سے باپ آجائے تو وہ باپ کیسے بن سکتا ہے ــــ ؟" کیوں کنیا ـــ ؟

لڑکی کے چہرے پر ایک حیا آمیز مسکراہٹ آگئی ۔ اس نے سوچا کس قدر عجیب بات ہے کہ ابھی ابھی مجھے بیچنے ہیں ایسے ہی مول تول سے گذر رہی تھی اور دیکھا جائے تو ابھی بھی میں ایک مرد ہی کے ہاتھوں میں ہوں ــــ مگر شاید محفوظ ہاتھوں میں !!

لڑکی کو نیچے کھڑا دیکھ بندو ہنسا ـــ " تم تو گھوڑے پر سے اس (مسّاکی) شّاتی سے کود پڑی ہو کہ لگتا ہے کہ ساری جندگی گھوڑوں پر سے کودتی رہی ہو" اور ہاتھ بڑھا کر اسے اوپر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا ــــ

" چلو جلدی سے بیٹھ جاؤ ــــ رات پڑے ہمیں اپنے گھر پہونچنا ہے ــــ " لڑکی بید سعادت مندی سے اسکے سامنے چڑھ بیٹھی ــــ

" تمہارا نام تو ہم نے پوچھا ہی نہیں چھو کریا ـــ "

" دیوالی " ــــ وہ دھیرے سے بولی ــــ

بندو چونک سا گیا ــــ " ارے واہ ـــ دیوالی ! ــــ پھر تمہارے ہاں چراغ اور تیل کا تو کوئی کھرچہ ہی نہیں ہوگا نا ــــ دن رات کے اجالے ـــ "

" نہیں بابو صاحب ہم لوگ تو اجالوں کے بیچ رہ کر بھی اجالوں کو ترسنے والے لوگ ہیں ـــ جسطرح میری ماں ہولی ہو کر بھی زندگی بھر رنگوں کے لیئے ترستی رہی ـــ "

بندو نے اچانک سوچا یہ بھی محرومیت سے فرار پانے کا ایک راستہ ہے ۔ خوشیوں سے محروم لوگ، اجالوں سے محروم لوگ، رنگوں سے محروم لوگ اگر اپنے نام دیوالی ہولی رکھ بھی لیں تو کیا انہیں اجالے اور رنگ مل جاتے ہیں ــــ ؟؟ وہ بولا کچھ نہیں سُنتے گیا ــــ

" ماں کو رنگین کپڑے پہننے کا اتنا شوق تھا، لیکن وہی بتاتی تھی کہ جب بابا کو بیگار میں گھیٹا گیا تو وہ بیمار تھے، بہانہ سمجھ کر زمین دار نے اتنا پٹوایا کہ دم نکل گیا ــــ پولس کیس بھی

نہ بن سکا ۔ پیسے میں بڑی طاقت ہے نا؟ پھر ماں نے کبھی رنگین ساڑھی نہیں پہنی ـــــ ساون میں جب سب سکھی سہیلیاں ہری رنگ کی چنریاں پہنتی تھیں تو ماں اپنی سفید کفنی ایسی ساڑھی پہنے برہا کا ایسا درد بھرا گیت گاتی تھی کہ ساجن اگر تم بردیس سے سونا لینے جاتے اور واپسی میں دیر ہو جاتی تو پہلے ہی میرے کاجل ایسے بال چاندی جیسے ہو جاتے، مجھے غم نہ ہوتا، لیکن تم تو ایسے بردیس گئے ہو جہاں سے کوئی واپس ہی نہیں آتا۔"

ماحول اچانک سناٹے میں ڈوب گیا تھا۔ بمشکل بندو پوچھ سکا۔

"اور ماں" ـــــ؟

"وہ ہولی تھی نا ـــــ؟ اس نے اپنے سونے جیسے بدن کی خود ہی ہولی جلا ڈالی ـــــ زمیندار نے اسے ایک دن گڑ کی راب بنانے اپنی حویلی پر بلایا تھا ـــــ راب کے ساتھ ساتھ اسے میری ماں بھی بہت مزے کی لگی تھی ـــــ

"تم بھی ـــــ میں بھی ـــــ ہم سب ہی، ایک ہی منزل کے راہی ہیں ......" خوش مذاقی کا وہ غلاف بندو پر سے سرک گیا تھا وہ غم کے ساتھ کہہ رہا تھا ـــــ ہم سب کی ایک ہی کہانی ہے ـــــ"

"ہم سب کی ـــــ؟ آپ کی بھی ـــــ" دیوالی نے حیرت سے پلٹ کر اسے دیکھا، مگر وہ کہیں ماضی میں کھو چکا تھا ـــــ

گھوڑے کی ٹپر ٹپر سن کر بابا بغل میں جانماز دبائے دروازے میں نکل آیا۔

اور بندو کو دیکھ کر بے حد حیرت سے بولا ـــــ

"میاں ـــــ تم ـــــ"؟

"ہاں بابا میں" ـــــ بابا حیرت سے دیوالی کو دیکھے جا رہا تھا ـــــ بندو نے ذرا آنکھیں چرا کر

ذرا اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے تعارف کروایا ـــــ

" بابا یہ ایک بے سہارا لڑکی ہے ـــــ راستے ہی میں ...... "

بابا نے مسکرا کر بات اُچک لی ـــــ " تو یوں کہو کہ راستے ہی میں منزل مِل گئی "

بندو شرما کر آئیں' بائیں شائیں کرنے لگا ـــــ

" نہیں بابا وہ کچھ بات ایسی ہوگئی کہ ...... وہ ہاتھ مَلتے ہوئے ذرا پشیمانی سے کہنے لگا "

ـــــ بابا میں آپ کو بعد میں ساری بات بتاؤں گا ـــــ اور دیوالی کی آنکھ بچا کر اس نے بابا کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے ـــــ

بابا نے ہنس کر دیوالی کو گلے سے لگالیا ـــــ " بیٹی بڑی نصیبے والی تھی جو اچھے ہاتھوں میں پڑ گئی ...... دیوالی نے گھبرا کر پہلے بندو پھر بابا کو دیکھا ـــــ بابا نے بڑی جلدی سے بات سنبھال لی ـــــ میرا مطلب تھا ہمارے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی بیٹی تمہیں ـــــ مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھنا اور ......

بندو جلدی سے اسکے کان میں جھک کر بولا ـــــ " مگر خدا کے لیئے مجھے بھائی نہ سمجھ لینا ـــــ "

بابا کھانے پینے کا انتظام کرنے اندر گیا تو بندو بڑی پریشانی سے بولا ـــــ

" یہ سالا گھوڑا تو میری جان کو ہی چپک گیا ـــــ "

دیوالی مسکرا کر بولی ـــــ " ارے واقعی آپ نے اسے کُھلا چھوڑ دیا ہے پھر بھی جا ہی نہیں رہا "

بندو ہنس کر بولا ـــــ " ہم رسّی تو کھلی چھوڑ دیتے ہیں مگر محبت سے باندھ لیتے ہیں "

دیوالی شرما کر دروازے میں چلی گئی ـــــ گھوڑے کی پیٹھ تھپ تھپا کر بولی ـــــ

" اب تو وہیں چلا جا جہاں سے ہمیں لایا تھا ـــــ میں اپنے گھر پہونچ گئی ہوں ـــــ "

کھانے ڈانے سے فارغ ہو کر بندو نے اکیلے میں بابا سے پوچھا ـــــ

"بابا میں دیوالی کو کہاں رکھوں ___ ؟

بابا نے ذرا حیرت سے اُسے دیکھا ___ " اپنے پاس اور کہاں ___ ؟

" لیکن بابا ___ وہ پریشانی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا " آپ بات کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کیجئے ___ میرے سینے پر آنے والے خطرے کی دو دھاری تلوار لٹک رہی ہے ___ میں جو لوگوں کی نگاہوں میں دھرماتما بن کر راج کر رہا ہوں، اگر انہیں پتہ چل جائے کہ میں نے گھر میں ایک ہریجن لڑکی رکھی ہوئی ہے تو سماج کے یہ ٹھیکے دار مجھے جینے دیں گے ___ ؟ شکوک اور مخالفتوں کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوگا اور میرا سارا مشن ٹھپ ہو کر رہ جائے گا ___

" تو یہیں رکھ لوں ___ ؟ بابا نے مشورہ دیا ___

بندو نے جھونپڑے پر ایک نظر ڈال کر دھیرے سے کہا ___

" بابا میں چاہتا ہوں کہ ایک خزاں رسیدہ پودا جسے پالا مار گیا ہے، ذرا بہار بھی دیکھ لے "

بابا اسکے منہ اُٹھائے پریشانی سے اُسے دیکھتا رہا ___ وہ کہے گیا ___ " بابا کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ دونوں ہی میرے ساتھ چل کر رہیں ___ دیکھنے والے سوچیں گے کہ آپ باپ بیٹی ہیں۔ میرے مہمان ہیں ___ " اور بڑی آس سے اُس نے بابا کو دیکھا ___ بابا نے ہاتھ ملتے ہوئے بے چارگی سے دیکھا ___

" میں نے کبھی سکینہ کو اکیلا نہیں چھوڑا بیٹا .... اور وہ خاموش رہ گیا ___

گھٹنوں کے بل جھک کر اس نے بابا کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے ___ " بابا روحوں کا اگر کوئی وجود ہے اور وہ دیکھ سکتی ہیں، محسوس کر سکتی ہیں تو ماں جی کبھی بُرا نہیں مانیں گی ___ آپ نے مجھے بیٹا بنایا ہے نا ___ ؟ میں ماں جی کا بھی بیٹا ہوا نا ___ ؟ کیا اولاد کا اِتنا بھی حق نہیں ہوتا ....

بابا اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے بولا ___ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے بیٹا ___ اُس نے بندو کے سر پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا ___

" لیکن حالات سنبھل جائیں گے اور تم دونوں کی شادی ہو جائے گی تو پھر میں یہیں چلا

آؤں گا ـــــ" وہ آنسو پونچھنے کو رکا ـــــ" برسوں کا بندھن بڑی مشکل سے ٹوٹتا ہے بیٹا ـــــ بڑی مشکل سے ......

دوسرے دن بندو سوٹ بوٹ میں ملبوس لمبی سی گاڑی میں سوار ہو کر آیا تو دیوالی اُسے دیکھتی ہی رہ گئی ـــــ آج وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہو رہا تھا ـــــ باوردی ڈرائیور نے مؤدب ہو کر کار کا دروازہ کھولا اور وہ یوں اُترا جیسے بادشاہ اُترتے ہیں ـــــ پھر وہ جھونپڑے کے اندر آیا ـــــ بابا اور دیوالی کو گاڑی میں بٹھایا اور ایک بہت ہی شاندار شاپنگ سنٹر میں جا کر گاڑی رکوا دی۔

دیوالی کے لیئے ڈھیر سارے کپڑے اور عورتوں کے ساج سنگار والا خوب سامان خرید کر جب وہ پھر گاڑی میں آبیٹھا ـــــ تب بھی دیوالی سحر زدہ سی اُسے دیکھتی رہی ـــــ پھر جب گاڑی ایک عظیم الشان بنگلے پر جا کر رُکی اور نوکر لوگ دوڑتے ہوئے آئے تب بھی وہ یونہی بھونچکی رہی ـــــ پھر جب اُن کے داخل ہوتے ہی ایک مستعد بیرا سفید وردی میں ٹھنڈے مشروب طشت میں سجائے داخل ہوا تو وہ جو سالس روکے تنی سی بیٹھی تھی، ذرا پرسکون ہوئی اب وہ سمجھ گئی کہ یہ سفید لباس والا ہی اس گھر کا مالک ہے ـــــ" شاید ہم لوگ دعوت میں آئے ہیں ـــــ" اُس نے اپنے آپ کو سنایا ـــــ

مگر بندو نے ایک کمرے تک دیوالی کو لے جا کر بتایا کہ اب سے اس کمرے میں تم رہو گی ـــــ" تو وہ پھر ڈرسی گئی ـــــ بندو کا مرصع لب و لہجہ اور مہذب اندازِ گفتگو.. وہ اپنے حواسوں پر شک کرنے لگی ـــــ

"اور سنو ـــــ وہ محبت سے بولا ـــــ" یہ سامنے کپڑے تمہارے ہیں انھیں اِس الماری میں سنبھالو ـــــ اور ساتھ ہی باتھ روم ہے، جا کر نہالو ـــــ" پھر اس نے مڑ کر

ایک نوکر کو تنخا طلب کیا ـــــ

"میم صاحب کے لیئے گرم گرم کافی اور ٹوسٹ لے آؤ ـــــ"

تو پھر خود کو پاگل لگنے لگی ـــــ اب جو غور سے اس نے مڑ کر اپنے کمرے پر نظر ڈالی تو چکرا سی گئی ـــــ عظیم الشان خواب دیکھنے کے لیئے بھی پہلے حقیقت کی دنیا کا وجود ضروری ہوتا ہے ـــــ کوئی انسان اپنے سامنے اعلےٰ اور ناممکن چیزیں دیکھے تبھی وہ اپنے تصوّر میں انہیں سوچ سکتا ہے اور خواب میں پا سکتا ہے ۔ یہاں تو زندگی میں ایسی کوئی رنگین گھڑی آئی ہی نہیں تھی ـــــ پھر یہ سب کیا تھا ـــــ؟ ہاں گاؤں کی ایک بڑھیا دادی سبھوں کو کبھی کبھار ایک پری محل کی داستان ضرور سُناتی تھی ـــــ تو ـــــ تو کیا یہ وُہی پری محل تھا اور وہ اسکی پری ؟؟ اُس نے زور سے سر کو جھٹکا ـــــ کہیں خواب تو نہیں ؟؟

نہیں ـــــ خواب نہیں تھا ـــــ سامنے ہی ایک کالی کالی سی شے کو کان اور منہ سے لگائے وہ برہمن اس پر لاکھوں کی باتیں کر رہا تھا ۔ اُسے ہنسی آ گئی ـــــ" پاگل ہے ۔ آس پاس کوئی بھی نہیں اور اکیلے میں بک بک کئے جا رہا ہے ۔

"ہاں ہاں ـــــ دو لاکھ ہی کی تو بات ہے نا ـــــ ارے تو اسمیں پوچھنے کا کیا سوال ہے 'کھٹی مال اُٹھا لو فوراً' ـــــ ایسے موقعے قسمت سے ہی ہاتھ لگتے ہیں ـــــ"

"تو کماری دیوی جی ـــــ ایسے موقع قسمت سے ہی ہاتھ لگتے ہیں ـــــ شاید کبھی پچھلی زندگی میں تم نے کوئی پُن کیا ہوا اور بھگوان نے اُس کا یہ صلہ دیا ہو" !!

کھانے کی لمبی چوڑی ٹیبل پر بھی دیوالی منہ کتھتھائے بیٹھی رہی ـــــ بابا تو ٹیبل کرسی پر یونہی اٹ پٹا سا محسوس کر رہا تھا ـــــ دیوالی بھی بڑی سخت مشکل میں پھنسی ہوئی تھی

بابا کھا کر چلا گیا تو دھرم راج نے شرارت سے اُسے چھیڑا ـــــ

"کھایئے بیگم صاحب ـــــ نزاکت کیلئے ساری عمر پڑی ہے ـــــ"

دیوالی منہ چڑھا کر بولی ـــــ ہم بہت ـــــ بہوت اونچی جات کے باہمن ہیں ـــــ پر جبرا

گریب ہیں ۔"

پھر وہ کھڑی ہو کر غصّہ سے بولی ــــ " آپ کو جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی ــــ آخر یہ سب ڈھونگ رچانے کا کیا مطلب تھا ــــ ؟

" مطلب وطلب کچھ نہیں کماری جی ــــ بات بس اتنی سی ہے کہ میں چاہتا تھا آپ مجھ سے بالکل بے تکلفی محسوس کریں ــــ پھر وہ شرارت سے بولا ــــ " ویسے آپ آزاد ہیں جہاں چاہیں جا سکتی ہیں ــــ مگر بس اتنی بات تھی کہ سوچا تھا آپ ساتھ رہیں گی تو ذرا ایکساتھ بیٹھ کر چائے وائے پی لیا کریں گے ــــ

دیوالی نے اُسے غصّہ سے گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے بولا ــــ

" م ــــ میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ ہمیشہ چائے ہی پیا کریں ۔ آپ چاہیں تو شوق سے کافی بھی پی سکتی ہیں ۔ یہ تو اپنی اپنی پسند کا سوال ہے ــــ "

دیوالی مُنہ پھیر کر مُسکرا دی ــــ

رات کو دیوالی سو گئی تو بندو بابا کے کمرے میں آیا ــــ

" بابا زندگی میں پروگرام تو بہت سارے بنا رکھے ہیں ، اب شروعات کرنی ہے ــــ میں اپنے گاؤں سے ابتداء کرنا چاہتا ہوں ــــ "

" تو بسم اللہ کرو میاں ، نیک کاموں میں سوچ بچار کیسا ــــ " ؟

" بابا آپ میرے لئے دُعا کیجئے ــــ وہ اُن کے پیروں میں جھکنے لگا ــــ بابا نے پکڑ کر اُٹھا لیا

" بیٹا سر صرف خدا کے حضور میں جھکتے بھلے لگتے ہیں ۔ ہم حقیر بندے کیوں ہمیں گنہ گار کرتے ہو ــــ اور رہی دُعا کی بات تو میری ہر آتی جاتی سانس تمھارے حق میں دُعا گو ہے ــــ "

لمبی سی گاڑی ایک نرم ہچکولے کے ساتھ رُک گئی اور بنا ڈھم ڈھم کے ہی ایک جمِ غفیر

اسکے آس پاس جمع ہو گیا، مانو کوئی نیلام ہونے جا رہا ہو۔

بچے، عورتیں، متجسّس مرد، ادھ ننگے، بھوکے فاقوں سے ادھ موئے ــــ جن کے جسموں پر میل کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں ــــ جن کے چہرے زبانِ حال سے کہہ رہے تھے ـ

"ہم بھوکے ہیں ــــ ہم بھوکے ہیں"

ڈرائیور نے ایک نسبتاً معقول آدمی سے پوچھا ــــ

"یہاں کوئی زمین بکاؤ ہے ــــ"

آدمی م ـ م ـ ہم کرکے ہکلا کر رہ گیا ــــ مارے رعب کے اسکی زبان ہی نہ کھلی۔

اب دھرم راج نے گاڑی سے اُتر کر ذرا اپنائیت سے پوچھا ــــ

"ارے بھائی ــــ یہاں کوئی زمین ـ کھیت ـ خالی جگہ بکنے کے لئے ہے ــــ"

"ہے صائب ــــ ایک دوسرا آدمی بولا ــــ پھر ہاتھ کے اشارے سے بولا ــــ بہت ہے صائب ــــ م ـ ہم مگر ......

"مگر کیا" ــــ دھرم راج نے نرمی سے پوچھا ــــ

"جمیندار صاحب کی ہے سب جگہ ــــ"

"ٹھیک ہے ہم بات کرلیں گے ــــ وہ اس وقت مل سکیں گے ــــ"

"کیوں نئیں صائب ـ وہ سدا حویلی میں ہی تو رہتے ہیں ــــ مگر چھوٹے سرکار ملیں گے ـ لین دین اب وہی کرتے ہیں ــــ"

"تو آؤ ہمارے ساتھ چل کر حویلی کا راستہ دکھاؤ ــــ"

اُس نے گاڑی میں بیٹھ کر اُس کے لئے جگہ بناتے ہوئے کہا ــــ اسکے ساتھ اسکا دس بارہ سال کا بچّہ بھی تھا ــــ اس نے ہچکچا کر بچّے کو دیکھا ــــ پھر گاڑی کو۔

دھرم راج مسکرا دیا ــــ "کوئی بات نہیں ـ بچے کو بھی ساتھ بٹھا لو"

گاڑی چل پڑی ــــ پیچھے بہت سارے پھل رکھے ہوئے ـ ـ دھرم راج نے انگور کا ایک بڑا سا خوشہ اُٹھا کر بچّے سے پوچھا ــــ بڑی نرمی سے مسکرا کر ....

"یہ تمہیں کیسے لگتے ہیں ___"

"بہت سندر ___" بچّہ غور سے انگور دیکھتے ہوئے بولا ۔

"سندر" ؟ دھرم راج حیرت سے بولا ___ "ارے بھائی میں ان کی سندرتا کی بات نہیں کر رہا، میں پوچھ رہا ہوں ان کا مزہ تمہیں اچھا لگتا ہے ___ ؟

بچّے نے بے بسی سے باپ کو دیکھا ___ باپ نے سر جھکا کر جواب دیا ___

"صاحب بارہ برس کا یہ ہو گیا ___ آج جندگی میں پہلی بار انگور دیکھ رہا ہے ۔ اور یہ سنگترے اور چیکو اور اننّاس اگر آپ گاؤں کے کسی بھی بچّے کو بتائیں تو کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ یہ کھانے کی چیج ہیں ___ وہ ......

"نہیں ___ نہیں ...... دھرم راج زور سے چِلّایا اور اس نے اپنی بانہہ میں اپنا منہ چھپالیا ___

حویلی آ گئی تھی ___ اس نے اپنا چہرہ اوپر کیا تو اس کا منہ آنسوؤں سے تربتر ہو رہا تھا ___ "اِن پھولوں کو کِھلنے دو ___ اِن پھولوں کو کِھلنے دو ___" اس نے تڑپ کر اپنے آپ کو سنایا ___

دو ایسے انسان آمنے سامنے کھڑے تھے جنھیں ایک ہی ماں نے جنم دیا تھا ___ لیکن دو الگ الگ ماؤں نے اُنھیں اپنا دودھ پلایا تھا ___ اور یہ دودھ کی پکار تھی کہ ایک غریبوں کو اوپر لانے کی بات کر رہا تھا اور دوسرا انہیں پچھاڑنے کی ___

"دھرم راج جی ___ آپ کے وچار ویسے بہت اونچے ہیں ___ اسکول اور ہاسپٹل کھولنے کی اسکیم بھی بہت اچھی ہے ، لیکن آپ جانیں یہ نیچ لوگ لاکھ آپ سر پٹخیں ، سدھرنے والے نہیں ___ آپ نے وہ کہاوت نہیں سنی کہ کتّے کی دُم بارہ برس نلی میں رکھو مگر ٹیڑھی کی پھر بھی

ٹیڑھی کی ٹیڑھی ___"

آس پاس بیٹھے ہوئے چھوٹے سرکار کے گرگوں نے زوردار قہقہہ لگایا ___ دھرم راج سنجیدگی سے بولے ___

"اگر دُم کاٹ ہی دی جائے تو ___"

سب کے ہنستے ہوئے منہ لٹک گئے ___ پھر وہ اسی رو میں کہے گئے ___ سوال صرف زمین کے بیچنے اور خریدنے کا ہے، میں آپ سے سماج سدھار کے اپدیش لینے نہیں آیا ___ آپ قیمت بتائیے ___"

"جس ٹکڑے پر آپ زمین لے کر ہاسپٹل بنانا چاہ رہے ہیں وہ تو بہت ہی ہوادار ہے، کھلے مقام پر ہے، گورنمنٹ بھی ایک بار کوشش کر چکی، مگر ہم نے طرح دے کر ٹال دیا ___ آپ اگر چاہتے ہی ہیں تو تین لاکھ میں ہو سکتا ہے" ___ انہوں نے ایک لاکھ سے بھی کم قیمت زمین کو خوب اونچا کر کے بتایا ___ اور دوسری اسکول والی زمین دو لاکھ میں ..... اور وہ دھرم راج کے چہرے پر ردِّ عمل دیکھنے کے لئے ذرا رُک گئے، جو کھڑے ہو چکے تھے۔

"ٹھیک ہے میرا اسکریٹری کل ضروری کاغذات کے ساتھ آجائیگا ___ باقی معاملات آپ اور ہم شہر میں طے کرلیں گے ___

چھوٹے سرکار اور اُن کے گرگے دیکھتے ہی رہ گئے اور دھرم راج نپے تلے پُر اعتماد قدموں سے چلتے اپنی گاڑی میں جاکر بیٹھ بھی گئے ___

لوگوں کا جمِّ غفیر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا ___ انہوں نے گاڑی سے سر نکال کر کہا ___

"اس گاؤں میں آپ لوگوں کی صحت اور بچّوں کی مناسب تعلیم کے لئے، ہم ایک ہاسپٹل اور ایک اسکول کھولیں گے ___ علاج بھی مفت ہوگا ___ تعلیم بھی ___ کتابیں، کاپیاں، پنسلیں، ضرورت کی ہر چیز اسکول سے ہی مفت ملے گی" ___ اچانک اس نے سوچا کہ اگر ان

سبھوں کو پتہ چل جائے کہ میری اصلیت کیا ہے ــــ تو ــــ ؟؟

دوسری بار دھرم راج سونا گاؤں آئے تو زمین دار کی ایک اور بڑی خالی حویلی کا سودا کر گئے وہ چاہتے تھے گاؤں میں بھی ایک مکان رہے تاکہ وقتاً فوقتاً اسمیں آکر رہیں اور زیر تعمیر بلڈنگوں کا خود بھی جائزہ لیتے رہیں ــــ

تیسری بار جب اپنی لمبی سی گاڑی میں دھرم راج گاؤں آئے تو بات چیت بجائے چھوٹے سرکار کے بڑے سرکار نے کی ــــ قہقہہ لگاکر بولے ــــ

"بڑا بھاری دل دیا ہے بھگوان نے آپ کو ــــ ہم نے تو لوگوں کو جمع کرتے ہی دیکھا ہے خرچ کرتے نہیں "

دھرم راج اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے دیکھتے رہے جس نے ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی ماں کا قتل کر دیا تھا ــــ ہاں وہ قتل ہی تو تھا ــــ اور وہ لمحہ ــــ زندگی کا وہی لمحہ ایسا فیصلہ کن لمحہ تھا جس نے انہیں ہندوستان بھر کی غریب ماؤں کے لیئے ــــ مجبور جوانیوں کے لئے، بھوکے پیٹوں کے لیئے ایک مشعل روشن کر دینے کا عظیم الشان حوصلہ عطا کر دیا تھا ــــ آج وہی شخص ان کے سامنے کھڑا تھا اور یہ اُن کی اعلےٰ ظرفی تھی کہ وہ اسکے سامنے مسکرا رہے تھے ــــ

"رائے صاحب ــــ وہ مسکرائے ــــ انسان دنیا سے خالی ہاتھ آتا ہے، جاتا بھی خالی ہاتھ ہی ہے ــــ پھر اگر ہم اپنے ہی جیسے چند انسانوں کے آرام اور خوشیوں کا سامان کر سکتے ہیں تو یہ جوڑ جمع کس لئے ــــ"؟

" پھر بھی اِن سکّوں کے پیچھے ہی ساری دنیا دیوانی ہے ــــ" ؟ رائے صاحب ہنسے

" دیکھئے رائے صاحب آسان سی بات ہے ــــ دھرم راج نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاکر اشارہ

کیا — وہاں یہ سکّے کام نہیں آتے جو ہم یہاں جوڑ کر رکھتے ہیں — اور جو سکّہ وہاں چلتا ہے وہ ہم جیسے گنہ گاروں کے پاس وہاں نہیں ہوگا — تو پھر اِن سکّوں کا حساب یہیں کیوں نہ صاف کر کے بھگوان کے سامنے جائیں ....

رائے صاحب اس جواب سے بھنّا کر بولے — " آپ بھگوان میں بہت وشواس رکھتے ہیں !! بہت بڑی بات ہے جناب . ورنہ آجکل کی نئی پود بھگوان تو کیا ماں باپ کو بھی نہیں مانتی "—

" بھگوان کی بھگتی مندر میں چند پھول ہار اور ناریل چڑھانے سے نہیں ہوتی رائے صاحب — انسانیت کی خدمت اور سیوا سب سے بڑی بھگتی ، سب سے بڑی عبادت ہے — اور میں اسی سیوا میں وشواس رکھتا ہوں "—

رائے صاحب ذرا بور ہو کر بولے — آج آپ کی آمد کا مقصد کیا تھا "— ؟

" مجھے اس بار بزنس میں امید کے خلاف کچھ زیادہ ہی منافع ہو گیا — چونکہ مجھے اسکی کوئی آس نہیں تھی اسلئے ضرورت بھی نہیں ہے ، اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ گاؤں کے جو ہریجن بہت زیادہ غریب ہیں — سب سے زیادہ غریب ہیں ، اُن کو کم سے کم ایک ایک ایکڑ زمین خرید کر تحفہ دیدوں کہ خود ہی کاشت کریں کھائیں — نہ کوئی مالک نہ کوئی نوکر "

رائے صاحب نے پنیترا بدلا — ذرا گرم ہو کر بولے — " اسطرح تو ہمارے کھیتوں اور زمینات کے لئے مزدور نہیں مل سکیں گے "—

" تو ہمارے اپنے یہ دو ہاتھ دو پیر کس لئے ہیں ، اگر بھگوان ہر کسی کو دوسرے کا محتاج کر کے بھیجنے والا ہوتا تو ہر ایک کے ساتھ اسپئیر پارٹس کی طرح چند ہاتھ ، چند پاؤں ، چند سر بھی روانہ کرتا — لیکن ظاہر ہے کہ بھگوان بڑا عقل مند آدمی ہے — اس نے ہر انسان کو دو ہی ہاتھ دیئے ہیں اور دو ہی پاؤں — پھر ذرا رک کر ...... " تو آپ زمین بیچ رہے ہیں "—

چھوٹے سرکار نے بتا دیا تھا کہ دھرم راج بڑا خر چیلا ، پاگل اور سر پھرا تھا

جوان ہے ۔ ایک ایک لاکھ کے دس دس لاکھ روپے دینے سے بھی نہیں چوکتا لین دین کی بات میں ہی کروں گا، اسلئے وہ تلملا کر رہ گئے ــــ ویسے دل میں تو یہ آرہا تھا کہ اسے اُٹھا کر چمٹے سے پکڑ کر پھینک دیں ــــ

"دیوالی ــــ چلو آج تمہیں سونا گاؤں گھما لائیں،"

"دیوالی مسکرا کر بولی "ــــ میں آپ کے ساتھ بیٹھی کیسی لگوں گی "ــــ ؟

"گاڑی جگمگانے لگے گی "ــــ

دیوالی شرما گئی ــــ" آپ تو مذاق بنا رہے ہیں میرا ــــ میرا مطلب تو کچھ اور تھا. وہ اداس سی ہو گئی ــــ آپ اتنے بڑے مہان آدمی ــــ پھر برہمن ـ میں نیچ ذات کی لڑکی ....

" تمہیں پتہ ہے بھگوان رام نے اچھوت شوری کے جھوٹے بیر کھائے تھے، لوگوں نے بہت غصہ بھی کیا تھا لیکن بھگوان رام نے جواب دیا تھا، جو چیز من کی لگن اور شردھا سے کھلائی جائے وہ پوتر ہوتی ہے ...... پھر وہ عجیب شرارت بھرے لہجے میں بولا ــــ

"ہمیں ایک آدھ دن اپنے جھوٹے بیر کھلاؤ نا "ــــ

" پھر آپ بھی میری طرح نیچ جاتی کے ہو جائیں گے "ــــ

" دیوالی تو یہ کہہ کر ہنس کر بھاگ گئی اور دھرم راج سناٹے میں آ گیا ــــ

دھرم راج دیوالی کے ساتھ ہنس بول لیتا تھا، لیکن اکیلے پن میں بس یہی خیال مارے ڈالتا تھا ــــ

" پہچان نہ لے کوئی "

" پہچان نہ لے کوئی "

بڑی بڑی محفلوں میں مذہب، بھگوان، گیتا، پاٹھ، مندر یاترا، ان تمام موضوعات

سے وہ سخت کتراتا، کیونکہ اس کی زندگی میں اِن چیزوں کا کوئی دخل تھا نہ معلومات ـــ جہاں ساری زندگی ہی بڑے لوگوں کے دھکے، جوتے، لاتیں کھاتے گذری ہو وہاں اِن باتوں کا گذر ممکن بھی کیسے تھا ـــ؟

دِن رات یہی دھڑکا اسکے جی کو مارے ڈالتا کہ کوئی میرے ماضی کو نہ کھوج بیٹھے ـــ حالانکہ وہ یہ بات بھی بخوبی جانتا تھا کہ اسکے ماضی کا راز دار سوائے بابا کے اور کوئی نہیں ہے اور بابا پر اُسے اپنی ذات سے بھی کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا ـــ اُسے ڈر تھا تو صرف یہ کہ اُسکے کام ادھورے نہ رہ جائیں ـــ ایک بار اگر لوگوں کا وشواس اُٹھ گیا تو پھر کبھی بات نہ بن پائے گی ـــ لوگ اسکی دھجیاں بوٹیاں کر دیں گے ـــ مذہب کے نام پر اتنا بڑا جوا کھیلا بھی نہیں جا سکتا ـــ کم سے کم اتنی دیر تک نہیں کھیلا جا سکتا ـــ اور جو گاؤں کے لوگوں نے اسکے دیالوپن سے متاثر اور با اُمید ہو کر یہ درخواست کی تھی کہ اچھوتوں کے لیئے ایک مندر الگ سے بنوایا جائے کہ وہ بھی کسی کے آگے ماتھا ٹیک سکیں تو نہ صرف یہ کہ اس نے حامی بھر لی تھی بلکہ ساتھ ہی یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اونچی ذات کا برہمن ہونے کے باوجود وہ پہلے دِن سب اچھوتوں کے ساتھ مندر میں بیٹھ کر پراتھنا کریگا اور بھجن کیرتن کرے گا ـــ!

دیوالی تیار ہو کر آئی تو وہ اُسے دیکھتا ہی رہ گیا ـــ دیوالی کو دیکھ کر پتہ نہیں اسکی ساری فکریں اور وسوسے کہاں پر لگا کر اُڑ جاتے تھے اور وہ فوراً ہی ہنستا کھیلتا مسکراتا ایک عام سا نوجوان رہ جاتا ـــ

"ماں قسم ـــ آج تو ڈائرکٹ شادی ہی کر لینی پڑے گی ـــ" دیوالی زور سے اس انداز پر ہنس پڑی۔ پھر اک دم سنجیدہ ہو کر بولی "ـــ آپ کے مُنہ سے آج پہلی بار ماں کا لفظ سُنا ہے ـــ میں نے کبھی پوچھا بھی نہیں۔ آپکے گھر والے کہاں ہیں ـــ؟"

دھرم داس اک دم سے رنجیدہ ہو گیا ـــ ماں ـــ ماں ـــ ماں ـــ تم کہتی

ہو کہ آج پہلی بار میرے منہ سے یہ لفظ سُنا ہے اور میں کہتا ہوں میرے جیون میں میری ہر باہر آنے والی سانس میں، میری ہر اندر جانے والی سانس میں ـــــ میرے روم روم میں صرف اسی ایک لفظ کی پکار گونجتی ہے ـــــ وہ مُنہ سے کچھ نہ بولا ـــ مُسکرا کر رہ گیا ـــ

"کسی دِن اپنی ماں سے مِلانے ضرور لے چلوں گا ـــ مگر وہ بات نہیں کرے گی ـــ اُسے اب مجھ سے زیادہ نیند پیاری ہے ـــ"

دیوالی نے دکھ سے دیکھا ـــــ وہ انسان تقدیر جس کے سامنے سرنگوں تھی دولت جس کے گھر کی باندی تھی، جو جی چاہے خرید سکتا تھا، جسے چاہے خرید سکتا تھا ماں کے نام پر ایک بچّے کی طرح رونے لگا تھا ـــ ماں! وہ عظیم محبّت جسے ساری دنیا کی دولتیں مِل کر بھی نہیں خرید سکیں ـــ

گاڑی کے سونا گاؤں پہونچتے ہی مخصوص ہارن کی آواز سُن کر لوگ جھمگٹے کی شکل میں جمع ہونے لگے ـــ دھرم راج اُن کے لئے بھگوان کا' اوتار کا درجہ حاصل کر چکا تھا ـــ بغیر کسی مطلب اور چھل کے وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا، اِس نے سبھوں کو اِس کا بن دامول غلام بنا کر رکھ دیا تھا ـــ ایک ایک کر کے آنے، اور چرن چھونے والوں کا تانتا ختم ہی نہ ہوتا تھا، ہر مُنہ سے دُعا نکل رہی تھی ـــ

دیوالی نے اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا اور بڑی شردھا سے بولی ـــ

"آپ نے میری ضرورت کا ہر سامان لا کر دیا تھا، میں روز سوچتی تھی کہ آپ سے کہوں کہ بھگوان کی ایک مورتی بھی لا کر دیں ...... دھرم راج نے اسے ذرا حیرت سے دیکھا" لیکن میں بھی کتنی نادان تھی۔ بھگوان تو میرے گھر میں ـــ میرے کمرے میں۔ میرے اپنے دِل میں ہی موجود ہے ـــ مجھے مندر جانے کی بھی کیا ضرورت ہے ـــ آپ جو میرے بھگوان .....

" مجھے اِتنا اونچا نہ اُٹھاؤ دیوالی —" وہ تیزی سے بولا " مت اتنا اونچا اُٹھاؤ کہ گروں تو سنبھل بھی نہ سکوں — مت مجھ پر اتنا اندھا وشواس کرو ......

لوگ باگ چونک کر اُسے دیکھنے لگے ...... دیوالی نے گھبرا کر اسے دیکھا، اسکے ماتھے پر پسینہ پھوٹ آیا تھا —

اِک دم اُس نے تیزی سے گاڑی موڑی — " آج میں تمہیں سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا دیوالی چلو گھر چلیں — سینے پر اتنا بڑا پہاڑ رکھ کر میں جی نہیں سکوں گا"

دیوالی دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ چھپائے ساری داستان سنتی رہی سنتی رہی، وہ کہتا رہا — کہتا گیا —

" اب خدا کے لیئے مجھے اونچے اونچے ناموں سے نہ پکارنا"

وہ شرارت سے بولی " اب تو میں آپ کو خود سے اور بھی زیادہ قریب پا رہی ہوں. — ایسا لگ رہا ہے کہ آپ میں اور مجھ میں جو ایک فرق تھا، اونچ نیچ کی جو دیوار تھی وہ ڈھے گئی ہے اور میں بڑی آسانی سے آپ کو چھو سکتی ہوں — پا سکتی ہوں"!

اُس رات فانوسوں میں جلتے ہوئے چراغوں کو دیوالی ایک ایک کر کے بجھا چکی اور اندھیرا اپنا تسلط جما چکا تو دھرم راج جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا —

" تمہیں پتہ ہے دیوالی تم سارے چراغ بجھا دیتی ہو تو بھی ایک چراغ روشن رہ جاتا ہے — تمہارے چہرے کا چراغ — جس سے میری زندگی میں روشنی ہے"!

سونا گاؤں کا نقشہ ہی چند مہینوں میں کچھ سے کچھ ہو گیا — پکی سڑکیں بن گئیں — اسکول کھڑا ہو گیا — ہاسپٹل تیار ہو گیا — نیتا بڑی لڑکیوں کے لیئے سلائی کڑھائی

کے سنبٹر کھل گئے ـــــ بوڑھے اور کمزور بوڑھوں کو، جن سے کھیتی کی مشقت ناممکن تھی، گھر بیٹھے آمدنی کے لئے بھینس، گائیں، ولادی گئیں۔ کسی نے فرمائش کی تو پولٹری فارم کھلوا دیا گیا۔

اور اُس دن گاؤں کے بیچوں بیچ جو ایک بہت ہی زرخیز اور شاداب لمبی چوڑی کھیتی تھی اسکی بات چیت کے لیئے دھرم راج تُلے ہوئے تھے ـــــ

چھوٹے زمیندار نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر دھرم راج کو دیکھا ـــــ

"اتنا بڑا کھیت ـــــ؟ آپ سنبھال نہیں پائیں گے"!

"مجھے سنبھالنا ہے بھی نہیں ـــــ وہ میں اپنے لیئے نہیں لے رہا ہوں ـــــ ایک اچھوت خاندان کے ۲۰، ۵ گھرانوں کی کھیتی کے طور پر میں انہیں تحفہ دینا چاہتا ہوں ـــــ

"قیمت"ـــــ؟ چھوٹے زمیندار نے بھویں اٹھا کر رعونت سے پوچھا ـــــ

میں نے آج تک کبھی قیمت کی بات کی ہے ـــــ؟ جو مناسب ہو ـــــ" اور ذرا ہنس کر کہا ـــــ" جو آپ کی جیب کو بھاتی ہو ـــــ"

بڑے زمیندار نے ہاتھ اٹھا کر بات روک دی ـــــ "لیکن وہ کھیت تو عین گاؤں کے بیچ میں ہے۔ اسطرح تو یہ نیچ جاتی کے لوگ ہم میں رل مل جائیں گے .....

دھرم راج انگلی اٹھا کر بولا ـــــ

That is the main Point

یہی وجہ ہے کہ میں خاص طور سے وہی زمین خریدنا چاہتا ہوں جو اچھوتوں کو ہمارے بیچ لے آئے۔ میں گاؤں کے بَرلی اور سرحدی کناروں پر ہریجن بستیاں بنانے کے خلاف ہوں۔ اسی طرح تو دوریاں بڑھتی ہیں ـــــ میں چاہتا ہوں انھیں دور کونے کھدروں میں نہیں ـــــ اپنے بیچ میں۔ اپنے قریب، اپنے دل میں بسا ؤں، تاکہ دوئی کے فاصلے مٹ جائیں ـــــ

لیکن دھرم راج جی آپ یہ بات بھول رہے ہیں کہ برسوں ....

دھرم راج نے بڑے زمیندار صاحب کی بات وہیں کاٹ دی ـــــ

"میں جانتا ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں یہی نا کہ برسوں سے یہ فاصلے قائم ہیں ــــ؟ لیکن یہ فاصلے قائم کس نے کئے ہیں ــــ؟ ہمیں نے نا؟ اور ہمیں انہیں توڑیں گے بھی. اور سچ جو پوچھئے اگر ہم نہ توڑیں تو اور کون توڑ سکتا ہے؟؟

وہ مسکرا کر دونوں باپ بیٹوں کو دیکھنے لگا ــــ

بڑے زمیندار کو کچھ نہ سوجھا تو اٹھ کر تیزی سے ٹہلنے لگے ــــ چھوٹے ٹھاکر اس وقت باپ کی کوئی بات سننے کے موڈ میں نہ تھے ــــ منہ مانگی قیمت کا سنکر وہ زمین بیچنے پر اُتاؤلے ہوئے جا رہے تھے،

دھرم راج کو وہیں چھوڑ کر وہ باپ کو اندر لے جا کر سمجھاتے ہوئے بولے ۔

"پتا جی ــــ آپ بات کی نزاکت کو نہیں سمجھتے منہ مانگی قیمت کوئی الّو کا پٹھا ہی دے سکتا ہے ۔ ایک لاکھ قیمت کے کھیت کے پانچ، پانچ لاکھ وصول کروں گا ــــ سب سے بڑی طاقت پیسہ ہے پیسہ ہو تو ہر جگہ جائداد خریدی جا سکتی ہے اور ہر جگہ حکومت کی جا سکتی ہے"

بڑے زمیندار نے دھرم راج پر اپنا غصّہ اُتارا ــــ"

"الّو کا پٹھّا ــــ بڑا دیش سدھار بنتا ہے، ہماری پوزیشن بگاڑ رہا ہے ــــ اور اوپر سے تم ہو کہ گاؤں کے بیچ اچھوتوں کو آباد کرنے میں اس کا ساتھ دینا چاہتے ہو ــــ ہمارے پُرکھوں سے کبھی ایسی انہونی ہوئی ہے ......

لیکن باپ کو بک بک کرتا چھوڑ چھوٹا ٹھاکر پھر سے دھرم راج کے پاس آ چکا تھا ــــ

"آپ کل تشریف لے آیئے کاغذات تیار کروالیں گے ــــ" پھر اندر کی طرف اشارہ کر کے بولا ــــ" پتا جی کی باتوں پر آپ کان نہ دیں پرانے لوگ نئے لوگوں کی بات ذرا مشکل ہی سے مانتے ہیں "ــــ

دھرم راج مسکرانے لگا ــــ پھر ذرا بن کر بولا ــــ

"یہ اِدھر اُدھر کے جو گاؤں ہیں ــــ جیسے چندا پور ۔ وہاں آپ کی کوئی زمین کھیتی بکاؤ

نہیں ہے —" ؟

چندا پور کے نام پر چھوٹے ٹھاکر کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گذر گیا — نفرت سے بولا — " دھرم راج جی — وہاں کے اچھوت تو اور بھی زیادہ نیچ ہیں — آپ سے بن نہیں پائے گا اُن کو سنبھالنا —"

" اور جب میں خود ہی اُن میں مل جاؤں — تو" — ؟ اور واقعی وہ اپنی دھن میں مگن تھا —

اور یہ سب کچھ محض ایک اور ایک ہی شخص کی بدولت تھا — دھرم راج — دھرم راج — دھرم راج — گاؤں والوں کی زبان پر صرف ایک ہی نام تھا۔ ایک ایسا نام جو اُن کے لئے بھگوان کے سمان تھا —

گاؤں میں ایک بچّے کے چیچک نکلی — دھرم راج ہر کام جو کسی سے اپنی نگرانی میں کرواتے تھے — فوراً گاؤں بھر کے لوگوں کے لئے چیچک کے ٹیکوں کا انتظام کیا گیا —

" ایک صحت مند معاشرہ ہی بہتر زندگی کی بنیاد رکھ سکتا ہے —" دھرم راج کا اُصول تھا —

حویلی والوں نے طوفان اٹھا کر کھڑا کیا —" جن سوئیوں سے یہ نیچ خون والے انجکشن لیں، کیا ہم بھی انہی سے لیں —" ؟ چاپلوس ڈاکٹر بھٹناگر ہاں میں ہاں ملائے گیا —

" بھگوان نے سب کا خون یکساں ایک ہی رنگ کا بنایا ہے وہ ایک ہی طرح رگوں میں دوڑتا ہے — خون میں بھی اونچ نیچ آگئی — ؟ لگاؤ بھائی اسی سوئی سے مجھے بھی ٹیکہ، جس سے ابھی ابھی تم نے کلوا دھیڑ کو لگایا ہے —"

اور دھرم راج نے اپنا صحت مند گورا گورا بازو آستین ہٹا کر سامنے کر دیا

" اسے کہتے ہیں جی سچا ریفارمر —" ڈاکٹر نے چاپلوسی دکھائی اور روئی سے بازو صاف کرنے لگا —" ایک دم وہ بازو دیکھ کر ذرا چونکا ہوا —

"پدم ——"؟ چاند کا نشان —— ؟ جناب بزرگوں سے جیسا سُنا تھا ویسا ہی اِس نشان کا اثر پایا؟"

"کیا سُنا تھا بھئی بزرگوں سے ——"؟ دھرم راج مسکرا کر منہ پھیرتے ہوئے بولا ——

"ارے جناب ہم انگریزی پڑھ، لکھ بھی گئے تو کیا ہوا —— اپنے پُرکھوں بزرگوں کی بات پر ایمان اور وشواس تو رکھتے ہی ہیں —— یہ صاحب جو آپ کے بازو پر چاند کا نشان ہے نا بڑے بوڑھے کہتے ہیں یہ پیدائشی نشان عمر بھر نہیں مٹتا اور جس کسی کو بھی بھگوان یہ نشان دے، اسکے اپنے بھاگوان ہونے میں کوئی شک نہیں —— سو صاحب آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

دھرم راج آستین نیچی کرتے ہوئے مسکرا کر بولے —— چلئے صاحب ایک چشم دید گواہ تو آج تو ملا ——" پھر ذرا رک کر بولے —— ڈاکٹر صاحب آپ سے ایک ضروری بات یہ کہنی تھی کہ یہ فیملی پلاننگ والے تولا کھ چیختے رہیں، ہمارے بھائی لوگ تو بچے پیدا کرتے ہی رہیں گے تو ہاسپٹل میں ایک دو تجربہ کار لیڈی ڈاکٹرز رکھنی تھیں مجھے —— آپ کا تو یہ فیلڈ ہے —— کوئی جان پہچان کی ڈاکٹرز ہوں تو مجھ سے کہیئے گا۔"

ایک ڈاکٹر تو میری پہچان کی ہے شانتی ڈاملے ——

بہت تجربہ کار بھی ہے، مگر کچھ سر پھرے ہے —— پہلے اِس کا اپنا میٹرنٹی ہوم بھی تھا، پتہ نہیں کیا جی میں آئی، بیچ دیا —— اب نوکری بھی نہیں کرتی اور ہاسپٹل بھی نہیں رکھا۔"

"بات کر کے تو دیکھئے ذرا ——"

"ارے صاحب بات کیا کر کے دیکھوں گا، راضی کر کے ہی لوٹوں گا —— آپ جیسے بھاگوان آدمی کا کام کون نہ کرے —— اس گاؤں میں سانچا آدمی تو بس آپ ہی ہیں سرکار —— باقی تو سب نام کے ہی بڑے ہیں —— کوڑی کوڑی سینے سے لگا کر رکھنے والے۔"

دھرم راج کے ڈسپنسری سے نکلتے ہی دوسرے لوگ آنے شروع ہو گئے —— ڈاکٹر کا وظیفہ جاری تھا ——

"ارے صاحب، ہم بھلے ہی انگریزی اور سائنس پڑھ لکھ گئے، لیکن اپنی مان مریادا تو نہیں بھول سکتے ـــــ اپنے ہی ہاتھوں کیسے ایک ہی سوئی سے برہمن اور اچھوت دونوں کو ایک ساتھ ٹیکہ لگائیں"؟

ڈاکٹر بابو ـــــ آپ کو بڑے زمین دار نے حویلی پر بُلایا ہے"۔ کسی آدمی نے آکر کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا ـــــ

ڈاکٹر صاحب کو جہاں چار پیسے زیادہ ملنے کی آس ہوتی فوراً وہاں پہونچ جاتے، کیونکہ دھرم راج جی کی ایسی کوئی پابندی اُن پر نہ تھی کہ ہاسپٹل کے نوکر ہوتے باہر کے مریض اٹنڈ نہ کریں۔ جی بھر کے دولت سمیٹ رہے تھے۔ اور دلوں میں نفرت کے بیج بھی خوب بو رہے تھے ـــــ کوئی دن جاتا تھا کہ یہ فصل پک کر تیار ہو جاتی ـــــ

"وہ دھرم راج کا بچّہ کیا کہہ رہا تھا"؟

بڑے رائے صاحب نے گرج کر پوچھا ـــــ

ڈاکٹر صاحب نے مسمی شکل بنا کر جواب دیا"۔ صاحب انہوں نے تو اسی سوئی سے انجکشن لگوایا جس سے تھوڑی دیر پہلے ایک چمار بھنگی کو لگ چکا تھا"۔

"ہوں ـ!" وہ تھوڑی دیر چُپ رہے ـــــ

سارے گاؤں کا ناس مار دیا ـــ اب سُنا ہے دوسرے آس پاس کے گاؤں پر بھی دستِ شفقت پھیرنے والا ہے"۔ ـــــ

"جی ہاں جناب ـــــ اُن کے ارادے تو بہت بڑے بڑے ہیں ـــــ اور صاحب بھگوان نے دولت بھی تو خوب دل کھول کر دی ہے۔ اور دل بھی خوب دیا ہے۔ واہ"

"واہ واہ ـــ بڑے صاحب گرجے ـــ آپ واہ واہ کر رہے ہیں اور یہاں برسوں کی بنائی ہوئی عزت خاک ہو رہی ہے۔ جس کنوئیں سے ہمارے کھیتوں کو پانی جاتا ہے اسی سے چمار زادے بھی پانی لے رہے ہیں ـــ جیسا اناج ہم کھاتے ہیں، وہ حرام خور بھی جوار باجری چھوڑ کر چاول گیہوں کھا رہے ہیں۔ بدمعاش کا بچّہ ـ انہیں ہائی برڈ سیڈ سپلائی کرتا ہے۔ گاؤں کے لچّے

لفنگے بھی، ہماری ہی طرح کے لباس پہننے لگے ہیں ــــ سڑک پر نکلے تو حویلی کی بہو اور گاؤں کی منیارن میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو سکتا ــــ اور تو اور نیچ ذات کے گندے انڈے فر فر انگلش اور صحیح ہندی بول رہے ہیں ــــ اور آپ واہ واہ کر رہے ہیں" !

"تو پھر صاحب میں کیا کروں"ــــ

لوگوں کے دلوں میں پھوٹ ڈالئے ــــ نفرت بھریئے ۔ آپ پڑھے لکھے ہیں یہ کام زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں "ــــ

"صاحب، گھر میں نوکر تو دھرم راج جی کا ہوں "ــــ

"اے صاحب گرجے "ــــ تو ہم کس الّو کے پٹھے کے مالک ہیں پھر"ــــ ؟ اور انہوں نے ایک موٹی سی گڈّی اُن کے آگے پھینک دی ــــ ! ڈاکٹر صاحب حویلی سے نکلے تو ایک ایک کتّا چھوٹی ہڈی چچوڑتا بیٹھا تھا ــــ

شانتی ڈاملے کسی حال اپنا ارادہ بدلنے پر راضی نہ تھیں ــــ

"کمال ہے ــــ ڈاکٹر بھٹناگر چڑ کر بولے ــــ بیٹھے بٹھائے ہزار روپے مہینے کی آمدنی ٹھکرا رہی ہو ــــ آخر لوگ ڈاکٹر سیوا کرنے کے لئے ہی بنتے ہیں ۔ کوئی گھر بیٹھنے کے لئے تو نہیں "ــــ

"نہیں ڈاکٹر صاحب پلیز. آپ مجھے فورس نہ کریں ــــ میں نے طوفان کی سی بھیانک ایک پوری زندگی گذار لی ــــ اب کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے کھانے بھر کو اتنا تو بھگوان نے دے رکھا ہے کہ روکھی سوکھی عمر بھر کھا سکوں "ــــ

"ارے جب گھی سے تر تراتی ملتی ہے تو روکھی سوکھی کیوں کھاؤ بھئی "ــــ

" یہ بھی ایک طرح سے اپنے گناہوں کا پرائشچت کرنا ہے "ــــ

ڈاکٹر صاحب ہنسے "ــــ ارے واہ تم جیسی نیک دیوی بھی کوئی گناہ کر سکتی ہے جس کا پرائشچت کرنا پڑے "ــــ

"ہاں ڈاکٹر صاحب ـــــ میں نے تو ایک ایسا گناہ کیا ہے کہ گنگا میں ایک بار ڈبکی تو کیا ساری عمر کے لئے گنگا میں ڈوب کر رہ جاؤں تو بھی وہ داغ نہیں دُھلے گا ـــــ زندگی میں کبھی مذہب، دھرم بھگوان کو نہیں مانا، لیکن اب دن رات یہی چنتا کھائے جاتی ہے کہ بھگوان کو کیا منہ دکھاؤں گی ـــــ"؟

"آخر بات کیا تھی ـــــ مجھ سے بتاؤ تو ـــــ دل ہی ہلکا ہو جائیگا ـــــ"

ہاں ڈاکٹر صاحب ـــــ میں مرنے سے پہلے کم سے کم کسی ایک انسان کو تو یہ بات بتا ہی دوں ـــ اتنا بڑا بوجھ میں تو اٹھا بھی لوں ـــ ارتھی اُٹھانے والے بس کر رہ جائیں گے ـــ"

شانتی ڈاملے کہتی گئیں ـــ آنکھیں پھاڑے ڈاکٹر بھٹناگر سُنتے گئے .....

"ہائے کیسا گل گوتھنا سا بچّہ تھا ڈاکٹر صاحب، کیسا بھاگیہ وان ـــــ بازو پر سچ مچ کے چاند جیسا پدم کا نشان ـــــ اور میں نے اپنے بدلے کی آگ میں اُسے ایک نیچی جاتی والی عورت کی بچّی سے بدل دیا! اب سوچتی ہوں کہ اس سے بڑا پاپ کوئی بھی عورت کر سکتی ہے ـــــ؟ ننھی سی جان جو ہزار وں لاڈ پیار سے ناز و نعم سے پلتی، جانے کن کن مصیبتوں کا شکار ہوئی ہو ـــــ رائے زادہ اشوک چکرورتی کی اولاد اچھوت بن گئی"!

"پھر بعد میں اسکا کچھ پتہ چلا ـــ"؟ ڈاکٹر بھٹناگر کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک پیدا ہوئی ـــــ

"کوئی نہیں ـــــ جس عورت کی بچّی سے میں نے اُسے بدل دیا تھا، بعد میں میں نے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ زمیندار کے کالے کرتوتوں کی وجہ سے اُس نے کنوئیں میں ڈوب کر خودکشی کر لی تھی ـــــ دونوں لڑکیوں کی لاشیں بھی کنوئیں سے ملی تھیں ـــــ پورا خاندان ہی تباہ ہو گیا تھا ـــــ سنا تھا بعد میں وہ لڑکا گاؤں چھوڑ کر شہر بھاگ گیا تھا ـــــ کوئی بارہ تیرہ برس کی عمر میں ....

"پھر ـــــ"؟

"پھر ۔۔۔" ؟ دنیا بہوت بڑی ہے ۔۔۔ بہوت بڑی ہے ۔۔۔ اور انسان اُس عظیم اور وسیع سمندر میں ایک قطرہ !! اور پہچان کے لئے محض ایک چاند کا نشان وہ بھی بازو پر جو آستین میں چھپی رہتی ہے ۔۔۔ ! کون کیسے ڈھونڈھ سکتا ہے ۔۔۔ بس بھگوان ہی بچھڑوں کو مِلا سکتا ہے ۔ اور کوئی نہیں ۔"

"تو میں چلی شانتی جی ۔۔۔ مگر کوشش کر و کہ دل کو آمادہ کر سکوں ۔۔۔ لوگوں میں گھری رہوگی تو غم اور گناہ دونوں کا بوجھ ہلکا کر سکوگی ۔"

دھرم راج کے شاندار آفس میں ایک بڑے سے خوبصورت فریم میں مہاتما گاندھی کی ایک تحریر آویزاں تھی ۔۔۔

"میں بھگوان سے پراتھنا کروں گا کہ مرنے کے بعد اگر دوسرا جنم مِلتا ہے تو میں ہریجن بنا کر پیدا کیا جاؤں ۔"

ڈاکٹر بھٹناگر دھرم راج کے آفس میں بیٹھے بڑی دیر سے اِس فریم کو تکے جا رہے تھے ۔۔۔ دھرم راج مڑا اور ہنس کر بولا ۔۔۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ بڑے سوچ بچار میں بیٹھے ہیں ۔"

"نہیں صاحب بات کیا ہوتی ، سوچ رہا ہوں مہاتما گاندھی بھی کتنے بڑے آدمی تھے ۔۔۔ کیا ہی اچھی بات کہی ہے ۔۔۔ واہ ۔۔۔ واہ صاحب واہ ۔"

دھرم راج نے ہزار بار کے دیکھے ہوئے فریم کو نئے سِرے سے مڑ کر دیکھا ۔۔۔ پھر جھینپے سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر اپنے کاغذات پر جھک گیا ۔۔۔

"مگر ایسے فریم تو نیچ ذات والوں کو ۔۔۔ میرا مطلب ہے اچھوتوں کو اپنے گھروں اور دیواروں پر لگانے چاہئیں ۔۔۔ آپ تو ...... اور انہوں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا

دھرم راج اک دم گڑبڑا گیا ۔۔۔ وہ گھبراہٹ میں ہنسا ۔۔۔ پھر سنجیدہ ہوا ۔ پھر ہنسا ۔ اسکے چہرے پر پسینہ پھوٹ نکلا ۔۔۔ اُس نے بات سنبھال لی ۔

"ہم نام کے برہمن ۔۔۔ کون سے ہمارے کام ایسے ہیں کہ برہمن کہلا سکیں ۔۔۔ اِسی

لئے یہ فریم ٹانگ بھی رکھا ہے کہ اپنی اوقات یاد آتی رہے"۔ وہ زور سے سنبھلا مگر ڈاکٹر بھٹناگر کی تیز نگاہوں کے سامنے اُسے محسوس ہوا کہ قہقہہ کچھ پھیکا پڑ گیا ہے۔

بات کرنے کی خاطر بات کرنی تھی ۔" پھر آپ نے کسی لیڈی ڈاکٹر کا انتظام کیا"۔؟

ڈاکٹر بھٹناگر اُسے دیکھے ہی گیا۔ جواب کچھ نہ دیا۔

دھرم راج یکایک اُکھڑ سا گیا۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب ...... میں ...... م ــــ مم ......

" آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا کہ آپ اُچھوت نہیں ہیں ــــ تو صاحب میں بھی کب کہہ رہا ہوں ــــ میں نے تو بس بات جیسی بات کی تھی ــــ آپ یہ کہاں کے بکھیڑے لے بیٹھے ــــ

تھوڑی دیر تک ماحول میں تناؤ سا رہا ــــ پھر ڈاکٹر بھٹناگر بڑی مکاری سی لجاجت سے بولا ــــ

" صاحب آپ تو بڑے دیالو ہیں ــــ بھگوان کی کرپا سے بھگوان سمان ہی ہیں ــــ یہیں شہر میں بیوی کو ایک پلاٹ پسند آ گیا ہے۔ صاحب اس حکومت میں ایک ڈاکٹر کی اوقات ہی کیا ــــ تیس ہزار کا پلاٹ آپکے لئے کچھ نہ سہی، مگر ہمارے لئے تو زندگی موت کا سوال ہے۔ اور وہ دھرم راج سے نظریں ملائے بغیر مہاتما گاندھی کے فریم کو تکنے گیا ــــ

دھرم راج تھوڑی دیر تو یونہی سُن بیٹھا رہا، پھر دھیرے سے اُٹھا، سیف کھول کر تیس ہزار کے بنڈل نکالے اور ڈاکٹر بھٹناگر کے سامنے رکھ دیئے ــــ

ڈاکٹر اٹھ کر چلا گیا تو دھرم راج نے اپنے آپ کو سنایا ــــ

دھرم راج ــــ میں خود عنقریب تمہاری پول کھول دوں گا ــــ صرف چند اہم کام اور سر انجام دے لوں ــــ اور ڈاکٹر کے بچے ــــ وہ دروازہ کی طرف دیکھ کر دانت پیس کر بڑبڑایا ــــ

"تجھ سے ــــ تجھ سے کسی دن سمجھ لوں گا ــــ اس وقت تو میں تیری مٹھی میں ہوں"

اُسی رات کو کھانے کی میز پر دھرم راج نے بغیر کسی پس و پیش یا شرم کے، بڑے بوکھلائے ہوئے سے انداز میں بابا سے کہا ـــــ

"بابا اگر آپ کی اجازت ہو تو کل میں اور دیوالی شادی کرلیں ـــــ" !!

دیوالی نے پریشانی سے اُسے دیکھا۔ "کہیں دھرم کا دماغ تو نہیں پھر گیا ـــــ جو کھلم کھلاّ بابا سے یوں بات کر رہا ہے"

" بابا نے اسکی پریشانی بھانپ کر توڑا ہوا لوالہ پھر سے پلیٹ میں رکھ دیا ـــــ کیا بات ہے بیٹا ـــــ تم اتنے پریشان تو کبھی دکھائی نہ دیئے ـــــ"

وہ پلیٹ سامنے سے ہٹا کر کرسی سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا ـــــ دیوالی اور بابا سے نظر ملائے بغیر اُس نے بڑی مشکل سے رک رک کر جملہ پورا کیا ـــــ

"بابا جس بات سے میں ڈرتا تھا کہ کہیں پہچان نہ لیا جاؤں ـــــ پکڑ نہ لیا جاؤں ـ وہی بات ہو گئی ـــــ کچھ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں اچھوت ہوں ـــــ بات پھیلتے دیر نہیں لگتی بابا ـــــ وقت کسی کے ساتھ مہربانی نہیں کرتا بابا ـــــ وہ اپنا چکر چلائے جاتا ہے ـ کون جانے وقت کا بے رحم پہیہ کب مجھے اور دیوالی کو اٹھا کر دور دور پھینک دے ـــــ اسی لئے بابا ـــــ وہ انتشار کی حالت میں کھڑا ہو گیا ـــــ اِسی لئے بابا میں چاہتا ہوں کہ تھوڑی بہت جو بھی خوشیاں میرے نصیب میں ہوں انہیں سمیٹ لوں ـ"

دیوالی کی سسکی کی آواز سُن کر وہ پلٹا ـــــ" رو رہی ہے پاگل ـــــ پریشان ہونے کے لیئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں کیا ـــــ"؟

بابا نے اُٹھ کر دیوالی کے سر کو پیار سے تھپکا ـــــ " بیٹا خدا اپنے نیک بندوں کی ہی آزمائش کرتا ہے ـ اٹھو دعا کرو ـــــ گھبراؤ نہیں ـ دُعا میں بڑی طاقت ہے ـــــ خدا سب ٹھیک ہی کرے گا ـــــ"

توقع کے بر خلاف ایک دِن لیڈی ڈاکٹر شانتی ڈاملے سونا گاؤں ہاسپٹل پہونچ گئیں

تنہائی کا بوجھ ــــ گناہوں کا بوجھ، ندامتوں کا بوجھ۔ آخر اکیلا انسان کتنے بوجھے ڈھو سکتا ہے ــــ بیٹھے بیٹھے انہوں نے سوچا ممکن ہے کسی کی خدمت کے صلے میں ایک آدھ ایسی دُعا مل جائے جو گنہ کے سارے داغ ہی دھو دے ــــ

ڈاکٹر بھٹناگر اُسے دیکھتے ہی ہڑبڑا گئے ــــ

"ارے تم ڈاکٹر ــ خیریت تو ہے"

آپ کے اصرار نے ــــ اور میرے اپنے حالات نے یہی سمجھایا کہ خود کو مصروف رکھنے میں بھلائی ہے ــــ میں دھرم راج جی سے ملنا چاہتی تھی۔ آپ نے اُن کے بارے میں مجھ سے کہا تھا نا؟ ــ"

ہاں ــ آں ــ ہاں ــ وہ گڑبڑائے ــــ وہ تو ٹھیک ہے ــــ لیکن وہ تو شہر میں رہتے ہیں اور بہت مصروف ہیں، کبھی کبھار ہی لوگوں سے ملتے ہیں ــــ میں خود اُن سے مدت سے نہیں مل پایا"

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اسی دوران وہ تین بار دھرم راج سے مل چکے تھے اور اب تک ایک لاکھ کا ٹوٹا پورا کر چکے تھے ــــ شانتی ڈاملے کو دیکھ کر انھیں وحشت سی ہوگئی کہ" وقت وقت کی ہی بات ہے، کبھی بھگوان نہ کرے اس نے دھرم راج کا بازو دیکھ لیا اور یوں پتہ چل گیا کہ یہی وہ سپوت ہے، تو پھر تو یہ ہزاروں کی آمدنی ہی گئی ــــ تھا تو وہ بے وقوف دھرم راج خود ہی برہمن بچہ ــــ مگر خود کو اچھوت سمجھے بیٹھا تھا ــــ اور اچھوت پن کو چھپانے کے ہزاروں روپے دیئے جا رہا تھا ــــ"

شانتی ڈاملے اُٹھ کر جا ہی رہی تھیں کہ باہر کار رُکنے کی آواز آئی اور کئی آوازوں کا ملا جُلا شور اُٹھا ــــ اچانک دھرم راج اندر داخل ہوا ــــ

"آیئے ــ آیئے دھرم راج جی ــــ" ڈاکٹر بھٹناگر اس بے وقت کی اچانک آمد سے حد درجہ پریشان ہو کر گڑبڑاتے ہوئے اُٹھے اور کرسی پیش کی ــــ

بیٹھنے سے پہلے ایک مہربان اور شفیق صورت عمر رسیدہ، صورت سے پڑھی لکھی خاتون کو دیکھ کر دھرم راج ٹھٹھک سا گیا اور اخلاق سے پوچھا ـــــ

"آپ کی تعریف ـــــ"؟

ڈاکٹر بھٹناگر نے بد دلی سے تعارف کرایا ـــــ

"لیڈی ڈاکٹر شانتی ڈاملے"

"اچھا اچھا ـــــ اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے ـ آپ کے بارے میں تو مدت سے سن رہا تھا ـ بڑے سو بھاگیہ میرے جو یوں آپ سے ملاقات ہو گئی ـــــ

شانتی ڈاملے انکساری سے مسکرانے لگی ـــــ

"تو پھر آپ ہمارے ہاسپٹل کا چارج لے رہی ہیں ماں جی ـــــ"؟

"ماں جی ـــــ"؟ شانتی نے گھبرا کر دھرم کو دیکھا ـــــ

محبت بھی انسان کو بےبس کر رکھ دیتی ہے ـــــ شانتی میں "نہیں" کہنے کی اب تاب ہی کہاں رہ گئی تھی ـــــ آبدیدہ ہو کر بولی ـــــ

"جب ماں کہہ دیا بیٹا تو پھر انکار کی جگہ ہی کہاں رہ جاتی ہے"

ڈاکٹر بھٹناگر نے بے موقع بے تو ڑ بات شروع کی ـــــ "دیکھنا حویلی والوں کے ہاں سے بلاوا آئے بھی تو نہ جانا ـــــ"

"لیکن میری طرف سے تو کوئی مناہی نہیں ہے آپ لوگوں کو ـــــ" دھرم راج نرمی سے بولا ـــــ

"وہ تو ٹھیک ہے آپ بھلے بھاگوان آدمی ہیں ـــــ وہ لوگ تو نام کے ہی برہمن ہیں بڑے خبیث قسم کے لوگ ہیں ـــــ"

دھرم راج اُسی رو میں کہے گیا ـــــ "چھوٹے سرکار کے بارے میں تو زیادہ نہیں کہہ سکتا لیکن رائے صاحب اشوک چکرورتی تو خاصے سلجھے ہوئے آدمی ہیں"

پھر ذرا مسکرا کر بولا ـــــ "بس ذرا غصہ جلدی ہو جاتے ہیں ـــــ پیسے والے ہیں نا"

اُس کے لہجے میں طنز چھپا نہ رہ سکا۔ لیکن شانتی ڈاملے کچھ نہیں سُن رہی تھیں ـــ

"ہائے ری قسمت پھنسا بھی تو کہاں لاکر ـــ لیکن اب تو اِس جال میں ہاتھ پاؤں ایسے پھنس چکے ہیں کہ چھٹکارا ممکن ہی نہیں ـــ"

ڈاکٹر بھٹناگر دھرم راج کے پیچھے پیچھے لپکے ـــ

"صاحب آج اچانک اِدھر آنا کیسے ہو گیا تھا؟"

دھرم راج نے معنی خیز نظروں سے اُسے گھور کر کہا ـــ

"ایسا لگتا ہے زندگی کے چند ہی روز باقی رہ گئے ہیں ـــ اِسی لئے سوچتا ہوں کہ جلدی جلدی بہت سی نیکیاں اور پُن کر ڈالوں ـــ اطراف کے چار گاؤں میں اسکول اور ہاسپٹل کے لئے زمین خریدتا پھرا ہوں ـــ!

"دھن ہو ـــ دھنیہ ہو ـــ ڈاکٹر بھٹناگر نے پیشہ ور سادھوؤں کے انداز میں الاپنا شروع کر دیا ـــ

دھرم راج جاتے جاتے مڑا ـــ "دیئے سے دیا جلتا ہے ـــ میں نے سوچا تھا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں ـــ دوسرے سے تیسرے ـــ اسطرح جہاں تک ممکن ہو سکے روشنی پھیلاتا چلا جاؤں گا کہ ایک حد وہ آئے کہ لوگ مٹھیوں میں بھر بھر روپے خیرات کرنے کو نکلیں اور کوئی لینے والا نہ ملے ـــ لیکن ڈاکٹر بھٹناگر ـــ جسطرح ایک دیئے سے دوسرا دیا جلتا ہے، اِسی طرح زہریلی ہوا کے ایک ہی جھونکے سے ایک ایک کر کے سارے دیئے بجھ بھی جاتے ہیں ـــ"

اُس نے اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا اور مڑ کر دیکھا تک نہیں ـــ

پتہ نہیں بابا کی رائے میں کون سی مصلحت تھی مگر انہوں نے دھرم راج سے یہ کہا تھا کہ ابھی فی الوقت دھوم دھڑاکے سے شادی نہ کرو ـــ مندر میں جا کر مالے بدل شادی کر لو ـــ سیشن بعد میں ہوتا رہے گا۔ اور دھرم راج نے ہر بات کی طرح بابا کی یہ بات

بھی مان لی تھی اور اگلا سنیچر شادی کے لئے طے کیا تھا کہ اچانک بہیر کو سونا گاؤں سے چند لوگ آگئے ــــ اتفاقاً مندر کے اوگھاٹن کا دن بھی سنیچر ہی قرار پایا تھا۔ اور چونکہ دھرم راج وعدہ کر چکے تھے کہ سارے اچھوتوں کے ساتھ مندر میں پراتھنا کریں گے اسلئے ناممکن تھا کہ وعدہ پورا نہ کرتے ــــ شادی کی بات تو ٹل گئی لیکن یہ بھی طے رہا کہ بابا اور دیوالی بھی سنیچر کو مندر پراتھنا میں ضرور جائیں گے ــــ

جب دھرم راج کی شاندار گاڑی سونا گاؤں کے سامنے جا کر رکی ہے تو بھیڑ کا عالم دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا ــــ آگے منڈپ تنا ہوا تھا جسمیں خوب جھکاجھک اُجالا ہو رہا تھا ــــ

سامنے نرم اور گدیلے صوفوں پر شہر سے آئے ہوئے، اور گاؤں کے بڑے لوگ، سماجی مرتبے دار لوگ، برہمن لوگ ــــ پیسے والے لوگ براجمان تھے۔ جو بس چلتا تو ہر گز اس محفل میں نہ آتے، لیکن چونکہ اب اس کام کی نوعیت کچھ کچھ سیاسی بھی ہو گئی تھی اور حکومتِ وقت کا ساتھ نہ دینا غیر دانش مندی میں شامل تھا، اسلئے آکر بیٹھ تو گئے تھے مگر سمنت بری بری صورتیں بنا رہے تھے ــــ سامنے شطرنجیوں پر نیچی جاتی کے لوگ، مرد، عورتیں بچے بھرے بیٹھے تھے ــــ پھر اسکولوں کے ماسٹر ــــ ہسپتالوں کے ڈائرکٹرز، زمین، پورا عملہ اور صرف سونا گاؤں کا ہی نہیں، اِدھر اُدھر آس پاس جتنی بھی جگہوں پر دھرم راج نے اپنی مہربانیوں سے روشنی پھیلائی تھی ــــ سبھی موجود تھے ــــ ایک قطار میں صوفوں پر رائے صاحب اشوک چکرورتی ان کی دھرم پتنی ــــ انکے بڑے بیٹے۔ چھوٹی بیٹی سلیکھا ــــ اُن سے ہٹ کر ڈاکٹر بھٹناگر ــــ ڈاکٹر شانتی ڈاملے ــــ ڈائس پر تیز روشنی میں دو تین سیاسی نیتاؤں کے ساتھ دھرم راج بیٹھے ہوئے تھے۔ نیچے پہلی قطار میں بابا اور دیوالی بھی نظر آ رہے تھے ــــ

مدتوں بعد آج شانتی ڈاملے نے اشوک رائے کو دیکھا تھا ــــ سینے میں جذبات اور کڑوی کسیلی میٹھی کسکتی یادوں کا طوفان موجزن تھا ــــ ایک دل کہتا تھا کہ جا کر کہہ دیں ایسی ایک بھول زندگی کا روگ بن گئی ہے ــــ پھر سوچتیں اس نے بھی تو میری زندگی کو ایک بھنور میں لا چھوڑا تھا ــــ

ایک دِل کہتا تھا اپنے گناہوں کا راز خود ہی کھول دیں ـــــ پھر سوچتی اگر وہ پوچھ بیٹھا کہ میرا لال میرا جگر کا ٹکڑا کہاں ہے ـــــ تو میں کہاں سے لاؤں گی ـــــ ؟ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے دِل کو سنبھال رہی تھیں ـــــ

" بھگوان مجھے شکتی دے کہ میں یہ سمے بخوبی ٹال سکوں "ـــــ

اچانک ڈائس پر سے اناؤنسر کی آواز گونجی ـــــ حاضرین ـــــ بہنو اور بھائیو ـــــ دھرم راج کی ذات کسی تعارف کی کسی پرچے کی محتاج نہیں ـــــ آپ نے جو کچھ بھی کیا اسکے لئے میں ایک ہی بات کہوں گا کہ جسطرح ایک چاند دنیا بھر کی تاریکی کو دور کر سکتا ہے، کچھ ایسی ہی مثال دھرم راج جی کی بھی ہے، وہ ایک ہیں مگر انہوں نے سونا گاؤں اور آس پاس کے گاؤں میں ایسے ایسے سماج سدھار کے کام کئے ہیں کہ لگتا ہے کہ وہ کئی ہیں ـــــ دھرم راج جی اپنی ہنسی روک نہ سکے کیونکہ یہاں پہونچ کر خود اناؤنسر نے ہی تالیاں بجانی شروع کر دیں، آج کی محفل میں بھی وہ پن اور ثواب کا ایک بہت بڑا کام کرنے جا رہے ہیں ـــــ اپنے ذاتی خرچے سے لاکھوں روپے کی مالیت کا بنوایا ہوا مندر آج اُن کے اپنے ہاتھوں کھلنے والا ہے ـــــ اس موقع پر ستیہ نارائن کی پوجا کیلئے جو پنڈت مہاراج آئے ہیں ـــــ وہ ابھی آپ سبھوں کے سامنے دھرم راج جی کو جنیو پہنائیں گے ـــــ پر اِس کام کے لیئے آپ میں سے کسی ایسی مہان ہستی استری کی سیوا درکار ہے جو شادی شدہ نہ ہو ـــــ اور عمر میں زیادہ ہو ـــــ

لوگوں نے گردنیں بڑھا کر آگے اور پیچھے جھانکنا شروع کیا ـــــ

اناؤنسر کی آواز پھر سے گونجی ـــــ " ہمارے دیش میں ابھی بدلیشی ملکوں کی چھاپ نہیں پڑی ہے ۔مطلب یہ کہ بہت خوشی کی بات ہے کہ سب لوگ خوشی خوشی شادی کرتے ہیں ....

" اور بے حساب بچے پیدا کرتے ہیں " ـــــ پیچھے سے کسی نے آواز لگائی ـــــ

لیکن تب تک دو تین پہچان والوں نے کھینچ کھانچ کر شانتی ڈاملے کو کھڑا کر دیا تھا ـ

" یہ دیوی جی غیر شادی شدہ ہیں "ـــــ

" تو براہِ کرم آپ ڈائس پر تشریف لے آیئے "

اناؤنسر صاحب کی آواز گونجی ـــ کانپتے قدموں سے شانتی ڈاملے ڈائس پر پہونچیں تو تیز اجالے میں اُن کا چہرہ دیکھ کر رائے صاحب اشوک چکرورتی اپنی جگہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے ـــ

اشلوک پڑھتے ہوئے پنڈت جی مہاراج نے بغیر کسی تکلف کے دھرم راج جی کا حلیہ ٹائٹ کر دیا ـــ پہلے ٹائی ـــ پھر کوٹ ـــ پھر شرٹ بھی ـــ

"غنیمت ہے یار پتلون رہنے دی" کسی منچلے نے پیچھے سے ہانک لگائی ـــ

دھرم راج جی نے سمنت پشیمانی اور بوکھلاہٹ کے ساتھ حاضرین کو دیکھا ـــ مگر بے چارے مجبور تھے ـــ

پھر پنڈت جی نے ایک لمبا چوڑا جنیئو دیوی شانتی جی کے ہاتھوں میں تھما دیا "پہلے اپنے بازو سے نکال کر گردن میں ڈالئے اور پھر ماتھے پر سیندور کے ساتھ .....

اور جب تیز روشنی میں جنیئو اور سیندور نکالنے کے لئے شانتی ڈاملے نے دھرم راج کا بازو تھاما تو وہ چاند اچانک ان کی آنکھوں کے سامنے آگیا جو چھپا ہوا تھا تو جانے کتنوں کی زندگیوں کو تاریک کئے ہوئے تھا ـــ

"بیٹا ـــ تم ـــ تم ـــ یہ چاند ـــ ....

دھرم راج نے ذرا شرما کر دیوالی اور دوسری خواتین کی طرف دیکھا اور دھیمے سے لہجے میں بولے ـــ

"جی ہاں ماں جی یہ میرا بچپن کا پیدائشی نشان ہے ـــ"

جنیئو اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گرا ـــ

"بیٹا ـــ وہ بمشکل خود کو سنبھال رہی تھیں ـــ آج مندر کے شبھ اوگھاٹن کے شبھ اوسر پر شاید بھگوان کو بھی مجھے سرخ رو کرنا تھا ـــ

دھرم راج نے ذرا غور سے انہیں دیکھا ـــ اچانک انھیں یاد آیا ڈاکٹر مہتہ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ کچھ سرپھری بڑھیا ہے"

"بیٹا تم اچھوت نہیں ہو ــــ اچھوت تو ہمتیں میں نے اپنے بدلے کی آگ میں جھلس کر بنا دیا ۔ تم تو رائے بہادر اشوک چکرورتی کے دوسرے بیٹے ہو" مائک جگہ جگہ فیٹ ہونے کی وجہ سے سارے میں آواز جارہی تھی ۔ شانتی کی بات پر رائے صاحب اور ان کی پتنی چونک کر اُٹھ کھڑے ہوئے ۔

دھرم راج سخت سراسیمہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا ـــــ کوئی بات اسکے پلّے نہیں پڑ رہی تھی ۔ پھر شانتی ڈاملے نے رک رک کر بھرے مجمع میں اشوک چکرورتی کو مخاطب کرکے کہنا شروع کیا ــــ

"جب تم نے میری زندگی کو کھلونا سمجھ کر دل بہلایا اور پھر توڑ پھوڑ کر پھینک دیا تو میں نے زندہ رہنے کا بہانہ ڈھونڈ نے ڈاکٹری کی پڑھائی پوری کر لی ـــــ ہاسپٹل تمہارے گاؤں سے دور ہی سے کھولا ، لیکن یہ بھی قسمت تھی کہ تمہاری اولاد کو میرے ہی جنم لینا تھا ـــــ ایک ہریجن عورت کی پکار کہ مجھے بیٹی نہیں چاہیئے اور تمہارا دیا ہوا جذبۂ انتقام ـــــ میں نے اپنے ضمیر کی آواز کو کچل کر تمہارا بیٹا ایک ہریجن عورت کی بچّی سے بدل دیا ــــ کہ جی بھر کے دُکھ بھوگے ، اتنے ہی دکھ جتنے تم نے مجھے دیئے ــــ بس بچّے کی ایک نشانی اتفاقاً میری نظر سے گذر گئی ــــ بازو پر چاند کا پدم ــــ پھر زندگی کے بھیڑ بھڑکے میں سب کھو کر رہ گئے ، مگر میرا ماتا کا مارا دل اُس ، بدنصیب بچے کے لئے سدا روتا رہا ــــ لیکن بھگوان کے کھیل بھی نیارے ہوتے ہیں ــــ میں نے جس بچّے کو اسلئے بدل دیا تھا کہ وہ ہریجن بن کر پلے بڑھے اور دنیا بھر کی ذلّتیں سہے ، وہی بچہ ساری ہریجن جاتی کیلئے ایک مشعلِ راہ بن گیا ــــ وہ ہریجن بچہ ـــــ جو دراصل برہمن ......

مگر اچانک دھرم راج چیخا ــــ میں برہمن نہیں ہوں ــــ میں برہمن نہیں بننا چاہتا ــ میں اچھوت ہوں ــــــ

"میں اچھوت ہوں ــــ"

ہر طرف ایک شور ــــ ہلڑ ــــ مچی ہوئی تھی ۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی ۔ رائے اشوک چکرورتی تو اپنی جگہ ندامتوں کے ڈھیر میں ڈوبے کھڑے تھے ، ان کی دھرم پتنی البتہ

لوگوں کو حیرتی بھار ٹی بیٹے تک پہونچ گئی تھیں جو آج اچانک ہی انھیں بُلا بلایا مل گیا تھا ـــــ وہ بٹا پٹ اسکی بلائیں لئے جا رہی تھیں مگر وہ عجیب کس مپرسی کا شکار بنا کھڑا تھا ـــــ

پھر سے شانتی ڈاملے کی آواز گونجی ــ " میں گہنہ گار یہ بوجھ نہیں اُٹھا سکتی تھی ' اسی لئے میں نے صرف ڈاکٹر بھٹناگر کو زندگی میں یہ راز بتایا تھا ' آج میں کس منھ سے بھگوان کا شکر ادا کروں " ــ دھرم راج نے اچانک مجمع میں سے ڈاکٹر بھٹناگر کو نکل کر تیز تیز جاتے دیکھا ' وہ اپنے آپ میں مسکرا کر پھر سے شانتی ڈاملے کی بات سننے لگا ـــــ

" میں کس منھ سے اپنے بھگوان کا شکریہ ادا کروں کہ اس نے میرے سینے اس بوجھ کو اتار دیا ـــ میں خود ہی نیچ جاتی کی کچلن میں دبی پسی ، یہ دکھ اور بھی جان لیوا تھا کہ ایک برہمن بچّہ کو ہرجن بنا ڈالا ....

" مگر ماں جی ـــ دھرم راج چلّایا ـــ آپ کس رشتے سے مجھے برہمن کہہ رہی ہیں ـــ میری ماں جس کا میں نے دودھ پیا وہ بھی اچھوت تھی ـــ جن لوگوں میں ، جس خاندان میں میں پلا بڑھا وہ سب اچھوت تھے ـــ یہ رشتہ کوئی کچّا دھاگا نہیں جسے ایک جھٹکے سے توڑ دیا جائے سانپ ہمیشہ چندن کے پیڑ سے لپٹا رہتا ہے مگر چندن اس سے زہریلا نہیں ہو جاتا ...... پھر وہ کچھ رکتے رکتے بولا . " اور سب سے بڑی بات میری ہونے والی دلہن بھی تو میری ہی طرح اچھوت ہے ـــ اور مجھے اپنے اچھوت ہونے پر فخر ہے کیونکہ ہمیں وہ لوگ ہیں جن کا دھرتی سے اٹوٹ رشتہ ہے .... اور جب یہ سب کہتے کہتے اس نے گھوم کر اس جگہ نظر میں دوڑائیں جہاں دیوالی بیٹھی ہوئی تھی تو وہ حیرت زدہ سا رہ گیا ـــ دیوالی پنڈال میں سے اٹھ کر دھیرے دھیرے باہر چلی جا رہی تھی ـــ

وہ اچانک تیزی سے اس کی اور دوڑا ـــــ

" دیوالی ـــ تم اچانک چلی کیوں آئیں " ــ اور اس نے دیوالی کا ہاتھ تھام لیا ـــ

" چھوڑ دیجئے میرا ہاتھ " ــ دیوالی غصّے سے بولی ۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے ـــ

" مگر ہوا کیا دیوالی ـــ میں نے کیا کیا ہے " ــ ؟ وہ لجاجت سے بولا ـــ

آپ پوچھتے ہیں آپ نے کیا کیا ہے ؟ میں کہتی ہوں آپ نے کیا نہیں کیا ہے ——————

—————— ہر بار ایک سے ایک نیا ڈھونگ رچاتے رہے ۔ کبھی برہمن بن جاتے کبھی اچھوت —— اور جب میں نے اپنے آپ کو آپ سے وابستہ کر دیا اور ایک سر پھری اور پاگل ندی کی طرح آپ کی ذات کے سمندر میں خود کو مِلا دینے کا عہد کر لیا تو —— تو ...... وہ اچانک زور زور سے رونے لگی ——

" میں بھول گئی تھی کہ آپ کے دل تک جو راستہ جاتا ہے وہ سونے چاندی کی اینٹوں سے بنا ہوا ہے اور میں دھول اور مٹّی پر چلنے والی ....

دھرم راج نے اسکے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ۔" بس —— بس —— کرو —— بھگوان کے لئے ایسی باتیں مت کرو —" ہم سب —— تم بھی —— میں بھی اُن لوگوں میں سے ہیں جو دکھوں کی کھیتی بوتے ہیں اور آنسوؤں کی فصل کاٹتے ہیں —— میں تم سے الگ کہاں ہوا دیوالی —— تم چلی گئیں تو میری زندگی میں ایسا اندھیرا چھا جائیگا کہ دنیا کے سارے چراغ مل کر بھی ہلکا سا اُجالا تک پیدا نہ کر پائیں گے "

دیوالی نے غصّہ سے اُسے دیکھا " اتنے بڑے گاؤں کے ٹھاکر اور مالک کے لیئے دیوالیوں کی کیا کمی " ؟

" دیوالی " دھرم راج جذبات کی شدّت سے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پیتا ہوا بولا ۔ " مت اتنی ظالم بنو "

" ظالم میں نہیں —— آپ ہیں —— جب آپکو پتہ تھا کہ آپ کون ہیں کیا ہیں تو اتنا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی —— ٹھاکر صاحب آپ زمیندار کے بیٹے ہیں اور بیٹے رہیں گے ۔ اور میں ....

دھرم راج نے غصّہ سے اسکی بات کاٹی ۔" دیوالی میں تم سے کہہ رہا ہوں مجھے یہ ساری باتیں واقعی نہیں معلوم تھیں "

اب تو معلوم ہو گئیں —— اور جب اپنے نئے ماحول میں آپ رچ بس جائیں گے تو وہی ہو جائیں گے جو سبھی ہوتے ہیں ۔ اور یہ بڑی بڑی باتیں دھری کی دھری رہ جائیں گی ۔ اک دم

وہ غصہ سے گھوم گئی — "یہ تو کہئے قسمت کی بات تھی جو آپ اچھوتوں کے بیچ پل کر بڑھے اور اُن کے دکھ درد کو محسوس کیا — اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو ...... دھرم راج نے ایک غم زدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لیا —

"یہی تو میں کہتا ہوں دیوالی — دانہ جب تک مٹی سے نہیں مل جاتا یونہی پڑا رہتا ہے اور جب مل جاتا ہے تو پھول بن کر ابھرتا ہے — کھیتی بن کر لہراتا ہے، بہار بن کر جھومتا ہے —————— ساری بات رشتوں کی ہے — میں اپنا رشتہ خوب سمجھ گیا ہوں — وہ کچھ آگے بڑھا —" اور اس پر بھی تمہیں اس مٹی سے میری وفاداری کا یقین نہیں آتا تو ایک لمحے کے لئے میری آنکھیں دیکھ لو — مائیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں — اور میری ماں تو بڑی ہی سچی تھی، وہ کہتی تھی پاپ اور جھوٹ آنکھوں میں اتر جائیں تو انسان کبھی کسی سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔"

دیوالی نے دھیرے دھیرے آنکھیں اٹھائیں اور دھرم راج کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں بٹھا دیں — دھرم راج کی آنکھیں، جو اتنی معصوم، اتنی شفاف اتنی محبت بھری تھیں کہ کوئی جھوٹ اُن میں سما ہی نہ سکتا تھا —؟

"پوجا کا سمے ہو گیا — مندر میں نہیں چلوگی —؟" دھرم راج دھیرے سے بولا —!

"میرے ساتھ —"!

اور سینکڑوں ہزاروں لاتعداد اچھوتوں اور نیچ جاتی کے لوگوں کے ساتھ جب دیوالی کا ہاتھ تھامے تھامے وہ مندر میں داخل ہو گیا اور اس کے نقشِ قدم پر چلتے چلتے اس کے اپنے ماں باپ بھائی بہن سبھی اندر پہونچ گئے تو بابا نے کھڑے کھڑے پیار سے سوچا —

"جب جب بھی ظلم اور ناانصافی کی گھور تاریکی چھائی ہے، تم ہی جیسا کوئی جیالا مشعل لے کر اٹھا ہے —"

اندر زور زور سے گھنٹیاں بجنے لگی تھیں —

پگھلتی آگ

"اے جی، ذرا میری چولی کے ہُک تو لگا دو پیچھے سے!"

"ہم..... ہم..... میں.....؟" ایک مردانی آواز —

آواز میں گھبراہٹ — کچھ خجالت — کچھ شرم۔

پھر وہی نسوانی کھنکھناتی نخرے بھری آواز — "اوہو ہو! کھولتے ہوئے شرم نہ آئی، آں، تم ہی نے تو کھولے تھے — اب کہہ دو نا میں نے تمہیں ہاتھ بھی جو لگایا ہو — یعنی، پھر بھری یہ درگت کس نے بنائی ہے؟ ساڑی اِدھر — چولی اُدھر......"

اور کچھ یوں دھینگا مُشتی، جیسے کوئی مرد بغیر منہ سے آواز نکالے اٹھا ہو کہ کسی عورت کو بانہوں میں دبوچا ہو — اور کپڑوں کی سرسراہٹ......

اور یہ سب کچھ عین بڑی بیگم کے کمرے کے برابر ہو رہا تھا صرف ایک دیوار ہی کی تو آڑ تھی اور دیوار بھی کم بخت اینٹ، سیمنٹ، پتھر، چونے ہی کی تھی، کوئی لوہے کی تو نہ تھی کہ اُدھر کچھ ہو تو اِدھر سنائی ہی نہ دے — کیا آنکھوں سے دیکھنا ہی سب کچھ ہے؟

اُدھر چھپا تھی — وہی مستعد دھوبن، جس نے حویلی کے میلے کپڑے دھوتے دھوتے اب ان کی قسمت بھی دھو کر رکھ دی تھی۔ اور مرد؟ ان ہی کے اپنے میاں — بڑے سرکار۔

بڑے سرکار ایسے کوئی بڑے پارسا تھے بھی نہیں کہ جن کے بھٹک اور بہک جانے کا بڑی بیگم

حلال ہے کر بیٹھ جاتیں۔ وہاں تو ساری زندگی ان ہی رنگ رلیوں میں گذری تھی۔ مشہور تھا کہ جیسے ہی رات چڑھتی اور نوکرانیوں کی فوج باورچی خانے سے ملے ہوئے بڑے برآمدے میں سوتی۔ بڑے سرکار اپنے دو چار حوالیوں موالیوں کے ساتھ ٹارچ لے کر نکلتے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک سوئی ہوئی قیامتوں کے چہروں پر ٹارچ چمکاتے جاتے، جو صورت سب سے زیادہ بھا جاتی ٹارچ کی روشنی وہاں زیادہ دیر تک کلبلاتی رہتی۔ پھر وہ اپنے محل نما کمرے کو پلٹ آتے اور تھوڑی ہی دیر میں وہ تحفہ سجا کر بنا کر ان کی خواب گاہ میں پہنچا دیا جاتا ــــ اللہ جانے اس کاروائی کی شریک بڑی بیگم بھی تھیں یا جان کر طرح دے جاتی تھیں۔ مگر یہ بات طے تھی کہ وہ اس حقیقت کو قبول کر چکی تھیں کہ مرد چگتا چرتا ہی مرد لگتا ہے۔ اور پھر ان کی خواب گاہ کو رونق بخشنے والیاں تھیں بھی کون نہیں ان کی پالی پوسی مسلمان چھوکریاں۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ نوکرانیاں بس بڑے سرکار کی رات بھر کی ہی سنگی ساتھی ہوتی تھیں۔ صبح اٹھ کر جس طرح وہ رات کے میلے کپڑے اتار دیتے تھے ویسے ہی اپنی ایک رات کی دلہن کو بھی نظر سے اتار دیتے تھے۔ نہ کبھی کسی پر ایسا دل آیا کہ گلے کا تعویذ بنا کر ڈال لیا ہو۔ نہ کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا تک بھی ــــ پھر بڑی بیگم اعتراض بھی کیا کرتیں؟ اور وہ یوں بھی ایسے دبدبے اور وقار والی خاتون تھیں کہ انہیں بار بار مرد کے پاس جانا بھی، چاہے وہ اپنا شوہر ہی ہو، اپنی عزت اور شان کے خلاف محسوس ہوتا تھا۔ ایسے میں انھیں تو بلکہ ایک طرح کی چھوٹ سی ملی ہوئی تھی، جس کی وہ عادی بھی ہو چلی تھیں، لیکن اس بار تو حد ہی ہو گئی۔ انھیں ایسا لگا کہ گویا ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہو کر رہ گئی ہو ــــ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ بڑے سرکار کا دل کبھی اس طرح ڈولے گا کہ کسی ہندو عورت پر آ جائے گا اور آئے گا تو یوں آئے گا کہ وہ اُسی کے یہاں گم ہو کر رہ جائیں گے۔

بڑی بیگم اور چمپا کا کبھی آمنا سامنا نہ ہوا تھا۔ حالانکہ وہ اسی حویلی کے باہری کوارٹروں میں سے ایک میں رہتی تھی جو نوکروں کے لیئے بنے ہوئے تھے۔ بھانت بھانت کے، ذات ذات کے نوکر ٹھنسے پڑے تھے ایک چمپا نا اصل کی کیا تخصیص تھی جو بڑی بیگم اس کے درشن کرنا چاہتیں ــــ ویسے بھی وہ بڑی مذہبی اور رکھ رکھاؤ والی بی بی تھیں ــــ اپنے نماز روزے، عبادت میں گم رہنے والی ــــ ان کے

کپڑے مسلمان لونڈیاں ہی دھوتی تھی۔ ان کی خود ساختہ پاکیزگی کا تصور اتنا شدید تھا کہ وہ خاندان والوں کی نگاہوں میں نکو بن کر رہ گئی تھیں۔ کوئی بے وضو ان کے حمام کے نل سے لوٹے پانی نہیں لے سکتا تھا۔ دِق کے مریضوں کی طرح انہوں نے اپنی ہر چیز — کھانے کے برتن سے لے کر فرنیچر تک — الگ کر رکھی تھی۔ بڑے سرکار اس پاکی اور پلیدی کی کِٹ کِٹ سے کبھی تو سخت عاجز آجاتے اور کبھی ہنس کر کہہ اٹھتے "بخدا یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے کسی عورت سے نہیں کسی مسجد سے شادی کر رکھی ہے۔"

کم بخت بات سے بات نکلی چلی آتی ہے، اصل بات تو یہی تھی کہ بڑی بیگم کی اس پاکی اور عبادت کے چکر نے ہی بڑے سرکار کو اُن سے دور کیا۔ ورنہ بڑی بیگم قیامت تھیں، قیامت وہ روپ وہ رنگ وہ کشش کہ انسان نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت تک نہ کر سکے۔ مگر جہاں کبھی میاں کا دل آیا اور انہوں نے ہاتھ پکڑا، بیر اپنے آپ میں سمیٹیں — "اے ہٹئے بھی — مجھے نماز کو جانا ہے۔" کبھی وقت بے وقت تمتمائے گال دیکھ کر انہوں نے اپنے ہونٹ بڑھائے کہ یہ چلّائیں — "ہٹئے بھی۔۔ میں نے مغرب کے وقت دعائے گنج العرش آدھی ہی پڑھی تھی۔ پوری کرنی ہے اور عشا کا وقت بھی سر پر آگیا ہے۔"

مرد آخر مرد ہی ہوتا ہے — کب تک طرح دے! اللہ میاں نے مرد کی فطرت بھی عجیب بنائی ہے۔ شریف بیوی میں بھی وہ تھوڑی سی چٹک مٹک اور چٹکی بھر طوا ئف پن کا آرزو مند ہوتا ہے۔ جس کا ہاتھ کھینچا جائے تو وہ ادا کے ساتھ جھٹک دے۔ قریب کرے تو کسمسا کر نکل جائے ایک ایسا انداز جو بچ نکلنے کے باوجود خود سپردگی کا کھلا اعلان ہو — بڑی بیگم میں ایسی کوئی ادا نہ تھی، وہ تو اللہ معلوم مارے باندھے کا ایک لڑکا ہی کیسے ہوگیا۔ ایسے میں نہ انہیں میاں کے بھٹکنے کا غم تھا، نہ کبھی جلن ہی دل میں محسوس کی — لیکن یہ سُن کر کہ اب کی بار میاں کا دل ایک ہندو عورت پر آیا ہے، اُن کا مذہبی جذبہ تن کر تلوار بن گیا — اب کوئی اُن سے پوچھے کہ بھئی عورت ہندو کہاں سے ہوتی ہے اور مسلمان کہاں سے؟ عورت عورت سب برابر ہے۔ مگر یہ احساس کہ ان کے اپنے شوہر نے کسی غیر مذہب کی عورت کو چھوا ہے۔ ان کو جلا کر خاک کر گیا۔ انہوں نے طے کر لیا کہ اب وہ ہاتھ کبھی ان کے جسم کو نہ چھو سکیں گے۔ جنھوں نے کسی غیر مذہب والی عورت کو چھو لیا ہے —

کیسی عجیب بات تھی کہ وہ عورت جس نے اپنے میاں کی رنگ رلیوں کو سدا اس نظر سے دیکھا ہو جیسے کوئی بچہ رنگ برنگے کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ اب سوتیا ڈاہ کی آگ میں بھنی جا رہی تھی۔ دیوار آڑ ان کی چھاتی پر مونگ چھوڑ، گیہوں، چنے، اُڑد سب دلے جاتے، مگر وہ کچھ کر نہ پاتیں۔ اُن کا اپنا کمرہ میاں کی خواب گاہ سے بالکل ملا ہوا تھا۔

میاں کی خواب گاہ جو پہلے اُن دونوں کی اپنی مشترکہ خواب گاہ تھی اُسی کے ساتھ والا کمرہ شروع سے انہوں نے اپنی آسانی کے لئے نماز روزے عبادت کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ بیچ میں دروازہ بھی تھا کہ دُور سے پھیر لگا کر آنے جانے میں تکلیف نہ ہو۔ بیچ کی دیوار چھت کے پاس سے دو دو بالشت کھلی ہوئی تھی کہ ادھر کوئی سانس بھی لے تو اِدھر سنائی دے جائے۔ اب جب موئی سانس جیسی چیز سائرن بن کر سنائی دیتی ہو تو ایسی دھینگا مشتی اور رنگ برنگے بولوں کا کیا ٹھکانہ تھا جو خود ہی بغیر کسی پردہ داری کے جان بوجھ کر علی الاعلان کہے جاتے ہوں! اور بڑی بیگم کو یہ بھرپور یقین تھا کہ وہ کم بخت نا اصل چھپا جان بوجھ کر، انہیں جلانے کو یہ سب تہیہ کرتی ہے۔ ان کا بس چلتا اور کہیں اسے دیکھ پاتیں تو شاید زندہ جلوا دیتیں، بھون کھاتیں ــــ لیکن کیسی عجیب بات تھی کہ محض دیوار آڑ اس کا بسیرا تھا اور کبھی جھلک تک نہ دکھائی دی ــــ بس آواز ہی آواز تھی، جس نے ان کے پورے وجود کو کان بنا کر رکھ دیا تھا۔

لیکن ایک دن ــــ ایک دن گرمی کے بھپاروں سے بولا کر بڑی بیگم جب مردانے باغ میں نکلی چلی آئیں جہاں سنتروں اور آم کے ٹھنڈے ٹھنڈے بے پناہ کنج تھے اور بیچ میں لہ لہا کرتا ٹھنڈے پانی کا حوض تھا، تو اچانک انہیں ایک ایسا منظر نظر آیا کہ وہ اپنی جگہ سنّا کر رہ گئیں ــــ بڑی بیگم کو اگر گرمی ستا سکتی تھی تو وہ تو تھی ہی ذات کی دھوبن ــــ سدا پانی میں رہنے والی مچھلی۔ اسے بھی تو ٹھنڈک کی ضرورت تھی ــــ اور ٹھنڈک اور تراوٹ حاصل کرنے اگر کوئی عورت محض آنگ کے کپڑوں سے حوض میں کود پڑے تو یہ کوئی جرم تو نہیں؟ اُس نے نہاتے نہاتے گھوم کر پیچھے دیکھا تو بڑی بیگم ــــ کہ سر تا پا عورت تھیں ــــ چکرا کر رہ گئیں۔ کیا دہکتی دہکتی جوانی تھی! انھیں لگا کہ اگر وہ اس حوض میں ہاتھ ڈال کر دیکھیں تو یقیناً اُس کے جوان جسم کی حدت سے وہ ٹھنڈا پانی گرم ہو گیا ہوگا

ایسی جوانی کہ کسی کے جسم سے انگلی بھی چھوا دے تو وہیں آبلہ پڑ جائے اور پھر اُس کی قیامت خیز سنسنی ـــــ جو ہونٹوں کے گوشوں سے بکھر کر سارے چہرے کو منوّر کر گئی تھی ۔ ایک دم بڑی بیگم کو احساس ہوا کہ بھیگی ہوئی عورت سراپا دعوتِ گناہ ہوتی ہے ۔ ممکن ہے بڑے سرکار نے اِس دہکتی آگ کو پہلی بار اسی روپ میں دیکھا ہو ـــــ اس وقت کیا وہ اپنا دامن بچا سکتے تھے ۔ سانولے بدن سے نکلتے یہ شرارے ۔ اور قیامت کا چلبلاپن ـــــ اور اس کی وہ جان لیوا ادائیں اور باتیں ۔ جو وہ رات دِن دیوار کی آڑ سے نہ چاہتے ہوئے بھی سنتی رہتی تھیں ! بڑے سرکار میں کیا دَم اور حوصلہ تھا کہ ایسی تلوار کی کاٹ سے محفوظ رکھ سکتے ؟ جب ہی تو وہ دیکھ رہی تھیں کہ بڑے سرکار جو ہر جوانی کے بس رات بھر کے ساتھی رہتے تھے ، اب اس کا پلّو بھی نہ چھوڑتے ۔ کیا عجب اکیلے دُکیلے جوتیاں بھی چاٹتے ہوں ! اب جب کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی تباہی کے سامان دیکھ چکی تھیں ، کسی صورت اس حویلی ، اِس ماحول میں گزارہ نہیں کر سکتی تھیں ۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ فوراً ہمیشہ کے لئے گاؤں چلی جائیں گی ۔ اللہ کا دیا وہاں بھی سب کچھ تھا ـــــ گھر کی کھیتی باڑی ، باغ بغیچے بھرپور آمدنی ، یہاں بھی دن رات عبادت کرتی تھیں ، وہاں بھی کریں گی ـــــ لیکن یہ روز روز کے تماشے تو اپنی آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا نہ کریں گی ـــــ وہاں کم سے کم اپنا خالص مذہبی ، اسلامی ماحول ملے گا ۔ یہ تو نہ ہوگا کہ میاں نے ابھی ابھی جن ہاتھوں سے کسی ہندو دھوبن کے جسم کو سہلایا ، جن ہونٹوں سے کسی غیر مذہب والی کے بوسے لئے اسی حال چلے سے اُن کے کمرے میں چلے آ رہے ہیں اور انھیں بھی چھو رہے ہیں ۔ ٹھیک ہے مذہب کے ناطے وہ گنہ گار ٹھہریں گی ، کیونکہ اللہ میاں نے شوہروں کے بڑے حقوق رکھے ہیں عورت ذات پر شوہر کی خدمت کی بڑی ذمّہ داریاں رکھی ہیں ، لیکن جب اپنا دل ہی خوش نہ ہو تو کاہے کی جنّت اور کاہے کی دوزخ ۔ ایسی جنّت کو لے کر کوئی کیا چاٹے ، جب خود اپنے دل میں دوزخ کی سی آگ بھڑک رہی ہو !

بڑے سرکار کی اماں گاؤں ہی میں رہتی تھیں ۔ کتنی ہی بار انہوں نے بہو بیگم کو بلوا بلوا بھیجا تھا کہ کبھی آئیں ، مہینہ دو مہینہ رہیں ، گاؤں کی بہار ، کھیتی باڑی ، میلے ٹھیلے دیکھیں ، لیکن وہ کبھی شہر

سے ہلیں بھی نہیں ۔ اب جو بہو بیگم لونڈیوں، باندیوں کی فوج کے ساتھ مستقل قیام کے ارادے سے پہنچیں تو اماں بیگم کے پوپلے موہنہ سے ہنسی جدا نہ ہوتی تھی۔

گاؤں والوں کے لیئے بہو بیگم کی آمد ایک جشن سے کم نہ تھی۔ اُن کے پہنچتے ہی ٹولیاں بنا بنا کر مرد، عورتیں، بچے، نذرانے حسبِ حیثیت تحفے لے لے کر صدقہ اتارنے پہنچنے لگے۔ مرد تو وہیں غلام گردش سے واپس پھیر دیئے جاتے کہ بڑی بیگم پردے کی سخت پابند تھیں۔ البتہ عورتیں اور بچے ان کے درشن کرنے کی سعادت حاصل کر رہے تھے۔

سرخ کنارے والی نیلی دھوتی، ناک میں نتھنی اور پیٹ پیٹھ دکھاتا بلاؤز پہنے جب ایک البیلی سی عورت تیل کا تھال لئے بڑی بیگم کے پیروں کے پاس پہنچی تو انہوں نے ایک اندیشے کے ساتھ اپنے پاؤں سکیڑ لئے، اور اپنے ساتھ والی نصیبن سے پوچھا: "یہ تو مجھے کوئی ہندوسی معلوم ہوتی ہے؟"

یہ بظاہر بے ضرر سا جملہ تھا۔ مگر آنے والی کے دل کو تیر کی طرح چھید گیا۔ اُس نے لمبی سی سَر اٹھا کر انہیں دیکھا تو ماتھے پر ایک بندیا بھی انہیں چمکتی نظر آگئی، وہ اور بھی سمٹ کر بولیں "نابابا ــــ تم ہندو ہو۔ میں گنہ گاری میں نہیں پڑنا چاہتی۔"

بندیا والی کی ساتھ والیوں نے ایک دوسرے کو گھبرا گھبرا کر دیکھنا شروع کیا کہ بڑی بیگم بغیر کسی شرمساری یا ندامت کے، وہاں سے اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ جاتے جاتے اپنی خاص کنیز کو ہدایت کرتی گئیں "میرے وضو کے لیئے پانی تیار کرادے ــــ کم بخت نے مجھے چھو لیا، مجھے پلید کر دیا۔"

یہ گاؤں اماں بیگم کا گاؤں تھا، جہاں شروع گھڑی سے آج کے دن تک انہوں نے پیار کے بیج بوئے تھے ــــ ہر ذات، ہر بھانت کے لوگوں کی یہ بستی تھی۔ کیا چمار، کیا دھیڑ، کیا نیچ کیا اونچ ــــ وہ سب لوگوں کی اماں بیگم تھیں۔ دیوالی پر ہندو عورتیں مٹی کی سکوریوں میں چراغ جلا کر آتیں اور حویلی کی منڈیریں سجا کر جاتیں ــــ ہولی پر پچکاریاں بھر بھر کر رنگ لاتیں اور نمازی اماں بیگم کے سفید کپڑوں کو داغ داغ بہانہ کر جاتیں۔ راکھی پر حویلی کے مردوں کو ہندو عورتیں راکھی باندھتیں۔ خود اماں بیگم کے ماتھے پر جہاں نمازوں نے ایک چمک دار گٹہ بٹھا دیا تھا۔ رنگین بندیا لگا کر جاتیں۔ عید، بقر عید، شب برات پر یہی غیر مذہب کے لوگ حویلی میں آ کر میٹھا، شیر خورمہ، سویّاں، کباب، حلوے کھا کر جاتے اماں بیگم

نے گاؤں بھر میں محبت اور پیار کی وہ فضا قائم کر رکھی کہ لگتا تھا سب ایک ہی ماں کے پیٹ کی اولاد ہیں ـــــ وہ کہا کرتیں " زمین اور عورت ایک ہی روپ کے دو نام ہیں۔ زمین سب کو اناج دیتی ہے، پیار دیتی ہے، زندگی دیتی ہے ـــــ یہی حال عورت کا ہے جو صرف محبت بانٹنا جانتی ہے۔ یہ سب لوگ میرے بچے ہیں۔ میں انھیں پیار نہ دوں تو کون دے۔ اسی اپنا پن سے گاؤں والوں کے لئے ایک دیوی کا درجہ رکھتی تھیں ـــــ اب اُن کے بڑھاپے کے دن تھے۔ کمر جھک گئی تھی، اعضا جواب دے رہے تھے۔ سر سن کی طرح جلنے جیسا اور دھوپ کی طرح اُجلا ہو گیا تھا۔ آنکھیں ایک زمانے کا سرد و گرم دیکھتے دیکھتے دھندلا چکی تھیں ـــــ ان کے ایسے چل چلاؤ کے وقت میں سب گاؤں والوں کو، جہاں کی بیشتر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ بہو بیگم کی آمد کی خبر ملی تو وہ اپنی جگہ پھول کی مانند کھل اٹھے کہ چلو حویلی نئے سرے سے آباد ہو جائے گی ـــ پیار محبت کی وہ جڑیں جو اس حویلی میں پیوست ہیں، نئے سرے سے مضبوط ہو جائیں گی ـــ لیکن بہو بیگم نے آتے ہی وہ ہاتھ جھٹکا کہ لوگوں کے دل مرجھا کر رہ گئے ـــــ یہاں سے وہاں تک سب ہی لوگوں میں چاؤں چاؤں ہو گئی کہ بہو بیگم نے لیلا دتی کا نذرانہ ٹھکرا دیا۔ مگر گاؤں کے بڑے بوڑھے جو ہمیشہ سے حویلی والوں کے خون کی جگہ پسینہ گرانے کو تیار رہے تھے۔ جنھوں نے اس حویلی کا برسوں نمک کھایا تھا، اس ہلکے سے وار سے زیر نہ ہو پائے۔ جوانوں کو انہوں نے یہ کہہ کر سمجھا بجھا دیا "بہو بیگم نئی نئی گاؤں آئی ہیں۔ شہر کی عادتیں پڑی ہوئی ہیں۔ ہوتے ہوتے ہم میں گھل مل جائیں گی"

مگر بڑی بیگم جو اپنے گھر چھوڑ پردیسی ہو گئی تھیں، اس حقیقت کو کبھی نہ بھول سکیں کہ انہیں جلا وطن کرنے والی ایک ہندو عورت تھی، جس نے اُن کے سر کا تاج آنکھوں دیکھتے اُٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ وہ کیسے اُس ذات کو معاف کر دیتیں؟ نفرت کا بیج اپنی جڑیں گہری کرتا گیا اور ایک تناور درخت میں بدلتا گیا۔

گاؤں پہونچنے کے چند دن بعد جب ہولی کا رنگین تہوار آیا تو بڑی بیگم اپنے کمرے کی کھڑکی سے سارا تماشہ دیکھتی رہیں کہ رات سے کس طرح ہولی جلنی شروع ہوئی۔ کس طرح لوگوں نے جھوم جھوم کر، گا گا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ـــــ پھر صبح وہ صبح وہ نماز اور قرآن شریف کی تلاوت سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھیں کہ بڑے دروازے پر دھوم دھڑکا شروع ہوا اور اُن کے آنکھوں دیکھتے ہلتی کانپتی

امّاں بیگم برآمدے والے بڑے تخت پر آکر بیٹھیں۔ عورتوں، مردوں نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کو داغ دار کیا اور کپاس ایسے سفید کپڑوں پر ہر رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ بکھر گیا۔ بڑی بیگم نے تھرّا کر یہ سب دیکھا۔

"یہ اماں بیگم کو ہو کیا گیا ہے؟ دیکھنا سیدھی دوزخ میں جائیں گی۔"

انہوں نے خود کو سنایا اور جھپک کے خود ہی دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔

ابھی انہوں نے تسبیح پر وظیفے کا ایک دور بھی پورا نہ کیا ہو گا کہ دروازے پر دستک ہوئی انہوں نے "اللہ اللہ، اللہ اکبر" کا ورد کرتے ہوئے جا کر دروازہ کھولا تو رنگوں میں ڈوبی گڑیا سی امّاں بیگم پوپلے موہنہ سے ہنس کر پوچھ رہی تھیں "اوئی بیٹا، گاؤں والے تمہارے سہاگ کی خیر منانے آتے ہیں۔ بندیا نہ لگاؤ گی؟"

اُن کا جی چاہا کہ چلا کر کہہ دیں "یہ سہاگ، راگ رنگ اور بندیا آپ ہی کو مبارک ہو" مگر وہ ضبط کر گئیں۔ سینے پر پھونک مار کر تسبیح کیل پر ٹانگتے ہوئے بولیں "اماں بیگم، آپ کافر بن گئیں ہیں تو بن جائیے۔ مگر خدا کے لئے مجھے کانٹوں پہ نہ گھسیٹئے۔"

اماں بی کا موہنہ اتر گیا ــــ انہوں نے بڑے دکھے دل کے ساتھ بہو کو دیکھا۔ تھوڑی دیر یوں ہی کھڑی رہیں، جیسے سوچتی ہوں کیا کہوں کیا نہ کہوں ــــ پھر جیسے بڑی مشکل سے بولیں "بیٹا کوئی کافر ہے نہ مومن سب ایک ہی ہستی کو پوجتے ہیں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا" بیٹا، سب انسان ایک ہیں۔ سب کے دل ایک ہیں۔ سب کا پالن ہار ایک ہی ہے "......

اماں بیگم، میں تقریر سننے کے موقف میں نہیں ہوں۔" انہوں نے جھلّا کر کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ کیوں کہ باہر آنگن مردوں سے پٹا پڑا تھا اور انھیں بے پردگی کا ڈر تھا۔

رفتہ رفتہ بہو بیگم کی گرفت حویلی پر پکّی ہو رہی تھی۔ اور اس دن مولوی صاحب کو برطرف کر کے گویا انہوں نے پہلی بار اپنے پوری طرح برسرِ اقتدار آنے کا ثبوت دیا تھا۔

مولوی صاحب اس حویلی میں مدتوں سے بچّوں کو عربی، اردو قرآن شریف پڑھانے پر مامور تھے۔ اس دن پڑھائی کے کمرے سے الگ کر ایک کرسی ڈلوا کر بڑی بیگم تسبیح رول رہی

تھیں، یہ بھی سوچا تھا کہ سنو تو سہی مولوی صاحب کے پڑھانے کا انداز کیسا ہے، اندر سے مولوی صاحب کی آواز آرہی تھی،" بچو، رابعہ بصری جو عبادت کرتے کرتے ایک مجذوبہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں، جذب اور کشف کی انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ اُن ہی رابعہ بصری کو ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے ہاتھ میں پانی لئے دوڑتی چلی جاتی ہیں لوگوں نے انہیں روک کر پوچھا "اے بی بی، آپ کہاں دوڑی جاتی ہیں اور اس آگ اور اس پانی کا مطلب کیا ہے؟" تو اُن بی بی نے جواب دیا: "میں اس آگ سے جنت کو جلا دوں گی اور اس پانی سے دوزخ کو ٹھنڈا کر دوں گی تاکہ لوگ محض جنت کے لالچ، یا دوزخ کے ڈر سے عبادت نہ کریں ــــ ارے عبادت خدا کی خوشنودی کے لئے کرو۔ عبادت اس لئے کرو کہ خدا تم سے خوش رہے اور جب خدا خوش رہے گا تو منزل آسان ہے۔ بچو خدا کو خوش کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کی مخلوق سے۔ اُس کے بندوں سے پیار کرو۔ مذہب، ذات پات کے خیالات کو دل میں لائے بغیر پیار کرو۔ ہمارے حضورؐ نے کہا ہے: بچو کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کو خوش رکھے ـــ یہ سوچے بغیر کہ پڑوسی کا مذہب کیا ہے ......"

بہو بیگم نے پردے کی آڑ سے یہ سب کچھ سُنا اور فوراً نصیبن کو بھجوا کر دیوار کی آڑ سے مولوی صاحب کو بُلا بھیجا۔ "آج کے وعظ سے آپ کا کیا مطلب تھا مولوی صاحب؟"

"جی ۔ جی ۔" مولوی صاحب نے ہاتھ ملتے ہوئے انکسار بھرے لہجے میں جواب دیا: "جی وہی جو ہونا چاہیئے تھا۔"

"صاف صاف کہیئے، آپ کا مطلب تھا کیا؟"

"جی بیگم صاحبہ ــــ امّاں بیگم کی برسوں سے یہ تاکید ہے کہ پڑھائی پڑھائی میں مؤثر طریقہ سے بچّوں کو سمجھایا جائے کہ دراصل سب مذہب قابلِ احترام ہیں اور دوسرے یہ کہ مذہب کا بھید بھاؤ اور اونچ نیچ اصل میں کوئی چیز نہیں ہے۔ اور ...."

"اور ۔ اور ۔ اور ۔ میں سب سمجھ گئی۔ آپ کا مطلب یہی تھا تاکہ بچّوں کے دماغ میں یہ ٹھونسا جائے کہ تمہارے پڑوسی جو ہندو ہیں، قابلِ محبت ہیں ـــ اُن سے پیار کرو؟"

مولوی صاحب چُپ!

"آپ یہی چاہتے ہیں ناکہ وہ اپنے مذہب کو چھوڑ کر ماتھوں پر تلک لگوائیں اور تہواروں پر دوزخ کی آگ کی طرح سرخ رنگوں سے اپنے کپڑے رنگوائیں ؟"

مولوی صاحب خاموش!

"میں نئی نسل کے ذہنوں میں ایسے غلط جراثیم نہیں پلنے دوں گی۔ کل سے آپ کی چھٹی"!

مولوی صاحب آنکھوں میں آنسو بھرے اماں بیگم سے کہہ رہے تھے " اماں بیگم، میں نے بچوں کو کوئی غلط تعلیم نہیں دی۔ اللہ جانتا ہے، میں نے آج تک بچوں کے ذہن میں وہی کچھ ڈالا ہے جس کا خود خدا اور رسولؐ نے حکم دیا ہے —"

اماں بیگم نے غم اور آنسو بھری نظروں سے ان مولوی صاحب کو دیکھا جن کی ہڈیاں یہاں کے بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے جھک گئی تھیں، انہوں نے برداشت اور ضبط کے بے پناہ مظاہرے کے ساتھ بس اتنا ہی کہا: مولوی صاحب، تنخواہ کی کوئی بات نہیں۔ وہ آپ کے گھر حسبِ دستور پہنچ جایا کرے گی لیکن آپ کی عبادتوں کا واسطہ — ایک ہی عرض آپ سے کرتی ہوں آپ خدا سے دعا مانگئے کہ بہو بیگم کی آنکھیں کھل جائیں۔ اس کا سویا ذہن بیدار ہو جائے"!

بہو بیگم کی آمد کے چار ماہ بعد اماں بیگم اس دنیا سے سدھار گئیں لوگ دہاڑیں مار مار کر روتے ہی رہ گئے۔ مگر بہو بیگم نے کسی غیر مذہب کے مرد عورت کو اجازت نہ دی کہ وہ اماں بیگم کا آخری دیدار کر سکے۔

"وہ زندگی میں جو کچھ کرتی رہیں۔ اس کی ذمہ دار وہ خود تھیں لیکن مرے بعد وہ میری ذمہ داری میں ہیں۔ میں میت کی بے حرمتی نہیں ہونے دوں گی"!

ایک لازوال مسکراہٹ اور نورانی دمک چہرے پر لئے اماں بیگم زمین کی پہنائیوں میں جا سوئیں۔ بڑی بیگم نے سنا تھا، خدا کے احکام سے دور جانے والوں کے چہرے مرے بعد سخت منحوس اور پھٹکار برے ہو جاتے ہیں۔ مگر اماں بیگم کا چہرہ کیسے چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا!

اماں بی جیسے گاؤں کی رونق اور برکت اپنے وجود میں سموئے ہوئے تھیں۔ ان کے مرتے

ہی گاؤں میں وہ کال پڑا کہ بس ۔ اس سال بارش ہی نہ ہوئی ۔ کالے کالے بادل چھاتے ضرور ، مگر ترسا ترسا کر یوں ہی ادھر ہی ادھر نکل جاتے کتنے ہی لوگ کھیتی باڑی سے مایوس ہوکر شہروں کی طرف نکل گئے ۔ ادھر ی بارش سے مایوس ہوکر گاؤں والوں نے محض سبزیاں ، ترکاریاں اگانے اور چھوٹے چھوٹے کھیت گوڑنے کی تجویز بنائی ۔ اس کے لئے پانی کا بندوبست کرنے کے لئے گاؤں میں کنوئیں کھود دینے کی اسکیم طے ہوئی ۔

پہلا کنواں بڑی بیگم نے احاطے میں کھدوایا ۔ نرم زمین تھی ۔ بیس بائیس ہاتھ نیچے تک ہی کھدائی ہوئی ہوگی کہ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی نے اپنا چہرہ جھلکایا ۔ ایک مزدور نے ملگجا پانی چلو میں لے کر موہنہ میں ڈالا اور خوشی سے بولا " میٹھا ہے میٹھا ! "

پانی میٹھا نکلے تو اچھے اعمال اور کرموں کی بشارت ہے ۔ کھاری نکلے تو یہ برے کرموں کا پھل ____ بہو بیگم نماز روزے کی پابند ۔ اللہ کی مقبول بندی ۔ ان کے کنوئیں سے میٹھا پانی نکلا ۔ گاؤں والوں نے چندہ کر کے جو کنواں کھدوایا وہ سخت بنجر پیاسی زمین میں تھا ۔ بڑی کوشش سے پاتال تک کھدائی ہوئی تب کہیں پانی کی جھلک نظر آئی ۔ چکھا گیا تو تلخ ، کھاری ، تیز ، ایسے پانی سے سبزیاں ، ترکاریاں کیا پنپ سکیں گی ؟ گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو سخت حیرت تھی کہ ایک ہی زمین سے ایک جگہ کھاری پانی ، دوسری جگہ میٹھا پانی کیسے نکلا ! سب اوپر والے کے کرشمے ہیں ۔ انسان کچھ نہیں کر سکتا ۔

کتنی ہی بار بڑی بیگم ان لوگوں کو کتنے ہی موقعوں پر دھتکار چکی تھیں ۔ مگر یہ لوگ وہ تھے جو برسوں سے اس حویلی کے وفادار تھے ۔ پھر ایک فلسفہ یہ بھی تھا کہ دھتکارنے کا حق بھی تو اسی کو جاتا ہے جو پیار کرتا ہے ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ بڑی بیگم دل میں پیار رکھتی ہیں ، صرف موہنہ سے کڑوے بول بول لیتی ہیں ۔

دینو مائی کی قیادت میں گاؤں کی عورتوں کا ایک وفد بڑی بیگم کی خدمت میں پہونچا ۔

" اماں بیگم ، آپ سے ایک درخواست ہے ۔ " اب اماں بیگم کے بعد بڑی بہو ہی گاؤں والوں کی اماں بیگم تھیں ۔

بڑی بیگم نے بہت الجھ کر ، مگر قدرے ضبط کے ساتھ پوچھا " کیا بات ہے ؟ "

"ہمارے کنویں کا پانی تو کھاری نکل آیا ہے، امّاں بیگم ...."

بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بولیں: "اپنے اپنے اعمال کی بات ہے یہ تو ...."

دینو مائی رسان سے بولی: "امّاں بیگم، اگر آپ کی اجاجت ملے تو ہم موٹا اور پائپ لگوا کر اپنے کھیتوں میں سینچائی کرالیں ...."

انہوں نے دوبارہ بات کاٹ دی: "میرے کنویں سے تم لوگ پانی لوگے؟ اس کو ہاتھ لگاؤ گے؟"

"امّاں بیگم پانی اُلیچنے کو اپنی ہی کی جات کا کوئی نوکر آپ لگوا دیں ....."

امّاں بیگم نعیبن کی طرف گھومیں: "اور اسی پانی سے میں نہاؤں گی وضو کروں گی؟ پھر میری کیا پاکی رہ گئی"

نعیبن دبی زبان سے بولی "بی بی جی اپنے مذہب میں ایسی پابندی کہاں ہے کہ ایک کنویں سے ہندو پانی لے تو مسلمان کے لیئے وہ ناپاک ہو جاوے ہے؟"

وہ چلّائیں: "یہ گھر بینیے والا نہیں ہے جہاں خدا کے احکام کی پابندی نہیں ہوتی، وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔" وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں: "تم لوگ یہ فرض کر لو جیسے میں نے کنواں کھدوایا ہی نہیں"

دینو مائی نے اُن کے پاؤں پکڑ لیئے: "امّاں بیگم، یہ تو سوچو آدھی آبادی تو گاؤں سے چلی گئی۔ آدھی بھوکوں مر رہی ہے۔ کیسے گھر بار چلیں گے کیسے گجر ہو گی؟"

"یہ اپنے بھگوان سے پوچھو ــــ مجھ سے کیا پوچھتی ہو؟" اور تسبیح رولتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

اسی رات جب غضب کی گرمی پڑ رہی تھی، زمین تڑخی پڑ رہی تھی، کیڑے مکوڑے گھبرا کر باہر نکل آئے تھے ــــ بڑی بیگم کا اکلوتا بیٹا شمیم زماں پانی پینے کے لیئے اٹھا۔ جیسے ہی اُس نے چھپر کھٹ سے پاؤں زمین پر ٹیکائے۔ اللہ جانے کس بلا نے پاؤں میں کاٹ کھایا کہ وہیں تیورا کر گر پڑا۔ دھڑ کی آواز پر بڑی بیگم کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ زماں زمین پر پڑا ہے اور پیروں کے پاس سے کالی کالی لمبی سی کوئی چیز سرسر کرتی نکلی چلی جا رہی ہے۔ غالباً سانپ تھا ــــ چیخ مار کر وہ پلنگ سے اتریں ــــ ساری حویلی جمع ہو گئی۔ حویلی سے باہر بھی ہاہا کار مچ گئی۔ لوگ بھاگتے دوڑتے آگے پیچھے حویلی میں

جمع ہونے لگے۔ ہر شخص اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ کوئی منتر کی رائے دے رہا تھا۔ کوئی شہر سے ڈاکٹر کو بلانے کو کہہ رہا تھا۔ زماں بے ہوش تھا۔ بڑی بیگم کے حواس گم ہو چکے تھے۔ وہ پتھر کی مورت کی مانند جمی رہ گئی تھیں ـــ عمر بھر کی کمائی آنکھوں کے سامنے لٹی جا رہی تھی۔ ساری زندگی کی کلفتوں کے بدلے بس یہی ایک پھل ان کے ہاتھ لگا تھا۔ آج اس کا بھی انت آ گیا تھا۔ پھر انہوں نے بڑی دیر سے یہ دیکھا کہ بہت سی عورتوں کے ساتھ دینو مالی حویلی میں داخل ہو رہی ہے۔ اس نے آتے ہی کس کر اپنی ساڑھی کا ایک ٹکڑا پھاڑا اور زماں کے پاؤں پر باندھ دیا ہے ـــ اب اس نے اپنے ہونٹ اس نیلے نشان پر جما دیئے ہیں ـــ لوگ رہا ہیا کر رہے ہیں۔ وہ مونہہ ہی مونہہ میں کچھ پڑھ کر تھوکتی جاتی ہے ـــ دھیمی آواز جیسے پاتال سے آ رہی ہے

"میں نے جندگی بھر ایسے ایسے دکھوں کا جہر پیا ہے کہ اس سانپ کے جہر کی کوئی ہکیکت میرے پاس نہیں ....." وہ بدنصیب بال بدھوا تھی۔ اس نے چوس چوس کر سارا زہر پھینک دیا ہے۔ زماں ہوش میں آ رہا ہے اور وہ بڑی بیگم بے ہوش ہو گئیں ہیں۔

بڑی بیگم خوشی اور دکھ کے بین بین ایسی سرحد پر کھڑی تھیں کہ اب نہ کسی سے کچھ بولیں نہ چالیں ـــ دن بھر جانا نہ تھی اور وہ تھیں ـــ زماں کمزور ہو کر ہیلا پڑ گیا تھا۔ شہر سے ڈاکٹر بھی آیا ـــ باپ بھی ـــ علاج معالجہ ہو رہا تھا۔ وہ رُو بصحت تھا ـــ اور بڑی بیگم کا سر سجدے سے نہ اٹھتا تھا ـــ

ابھی شاید مصیبتوں اور آزمائشوں کا دور شروع ہو رہا تھا ـــ ایک رات بڑی بیگم کے دیکھتے ہی دیکھتے مویشیوں کے کوٹھے میں، جہاں سوکھا چارا رہتا تھا، آگ لگی ـــ گرمیوں کی آگ ایسی پھیلی کہ پلک جھپکتے میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اور پھر بڑی بیگم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کے پڑوسی جو سب منہ دھے، اپنے اپنے گھروں سے نکلے، مٹکے، بالٹیاں، ڈونگے، جس کے جو ہاتھ لگا پانی سے بھر بھر کر دوڑنے لگے۔ جسے پانی میسر نہ آیا، ریت سے پتیلے بھر بھر کر پھینکنے لگے۔ کئی جانور جل کر مر گئے کئی جھلس گئے۔ حویلی دھوئیں سے اٹ گئی۔ مگر جمع ہوتے ہوتے دل والوں نے آگ بجھا کر ہی دم لیا۔ بڑی بیگم شکریہ کا ایک لفظ تک نہ بول پائیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہیں۔ جب ذرا

آپے میں آئیں تو وضو کیا اور مصلّے بچھا کر عبادت میں مصروف ہوگئیں۔

گاؤں کے ہندوؤں نے مندروں میں چڑھاوے چڑھائے، مسلمانوں نے مسجدوں میں عبادتیں کیں کہ اب کی بار جو کنواں کھدے اُس میں میٹھا پانی نکلے۔

اُس رات بڑی بیگم کے پاؤں دباتے دباتے نصیبن نے انہیں یہ اطلاع دی تو بڑی بیگم سوچ میں ڈوب کر کہیں دُور سے بولیں " اور جو اِس بار بھی کھاری پانی نکل آیا تو؟"

نصیبن ٹھنڈی آہ بھر کر بولی " پھر تو اس گاؤں والوں کا خدا ہی حافظ ہے۔"

بڑی بیگم پھر کچھ نہ بولیں۔

وقت —— بے رحم وقت، جو گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک سے عبارت نہیں ہے —— وہ تو عبارت ہے اُن ہے اُن مصیبتوں اور غموں اور کٹھنائیوں سے جو دل کے دروازے پر دھیرے دھیرے دستک دیتی ہیں۔ کھٹ کھٹ اُسی وقت نے اب بڑی بیگم کے دل کے دروازے پر دستک دینی شروع کی ہے۔ ہرکارے نے شہر سے آنے والی چٹھی ہاتھ میں لاکر تھمائی ہے۔ —— بڑے سرکار دل کے دورے میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

یہ غم جیسے اُن کا نہیں، کیونکہ وہ تو یوں ہی ٹھونٹھ بنی بیٹھی ہیں غم تو اُن کا ہے جو سب حویلی کے آنگن میں بیٹھے، کھڑے ہیں جو سسک سسک کر، چلا چلا کر، چھپ چھپ کر، منہ پھیر پھیر کر رو رہے ہیں۔ یہ انسان ہیں یا حیوان؟ جذبات سے عاری جان دار! یہ تک نہیں سوچتے کہ ہم یہ آنسو کس کے غم میں، کس کی خاطر بہا رہے ہیں —— جس نے ہمارے نذرانوں کو ٹھکرا دیا! جس نے ہماری محبت کو ٹھوکریں ماریں! جس نے ہمیں پانی کے ترسایا! جس نے ہمیں اپنے پیار کو تڑپایا! جن تھالوں میں پیار سے صندل اور چندن سجا کر لائے تھے کہ اتلک سجائیں اُن تھالوں کو اٹھا کر پھنکوایا —— مٹی کے چراغ، جن میں تیل کی بجائے ہمارے دل کا لہو جل رہا تھا، بھری دیوالی میں پھونکیں مار مار کر بجھا دیئے۔ پھر پیار کا وہ کون سا رشتہ ہے! کیسا پکا دھاگہ ہے جو ٹوٹنے میں آتا ہی نہیں؟

یہ لیلا دتی ہے۔

یہ پارو ہے۔ یہ شنکر کی مالا ہے۔ یہ شانتی ہے۔ یہ ببنو ہے۔ یہ دینو مائی ہے۔
یہ سب رو رہی ہیں ۔۔۔ رہ رہ کر بڑی بیگم کی طرف دیکھتی ہیں کہ اُن کو گلے سے لگاکر اُن کے
دل کی بھڑاس نکال دیں۔ آنسو رک جائیں تو دل پر پتھر بن کر جم جاتے ہیں ۔۔۔ انہیں بہنا ہی چاہیئے ۔۔۔
ان چٹانوں کو پگھلنا ہی چاہیئے۔ مگر ہم انھیں ہاتھ کیسے لگائیں ۔۔۔ بڑی بیگم کا پاکیزہ وجود کیسے برداشت
کر پائے گا کہ ہم انھیں گلے لگائیں، ان کے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو اپنے ناپاک آنچلوں سے پونچھیں؟ ۔۔۔
لیکن تحریریں دل کی آنکھوں سے پڑھی جاتی ہیں ۔۔۔ بڑی بیگم نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی سسکتی
تڑپتی اُن بے چین آنکھوں کو دیکھا ۔۔۔ زندگی بھر کی جمی ہوئی ساری نفرت اُن کی اپنی آنکھوں کے راستے
بہہ نکلنے کے لیئے بے قرار ہو رہی تھی۔ دِچمپا کا نام مریم، کلثوم، گلشن، زیتون، وحیدہ، سلمیٰ بھی تو ہو
سکتا تھا ۔۔۔ اس کا اپنا قصور کیا تھا؟ اس کی جگہ کوئی مسلمان عورت میرے میاں کو ہتھیا لیتی تو ہی
”دینو مائی ......“ بڑی بیگم کی آواز میں جیسے امرت گھلا ہوا تھا۔ ”دینو مائی، تو مجھے گلے کیوں
نہیں لگاتی؟“ اُن کی خشک آنکھیں رونے کو بے قرار ہو رہی تھیں۔
دینو مائی نے روتے روتے غیر یقینی اور حیرت بھرے انداز سے ان کی طرف دیکھا ۔۔۔ پھر وہ
اٹھی اور تیر کی طرح چلی اور پھر یوں جگر پھاڑ کر دونوں روئیں کہ حویلی تھرّا اٹھی۔ پاکی اور ناپاکی کے
تصور سے پرے آج ان کا رواں رواں اس محبت بھرے لمس کی گرمی سے سرشار ہو اٹھا۔ دینو مائی
کو کلیجے میں بھر کر تھرتھراتی آواز میں وہ بولیں: دینو مائی ۔۔۔ گاؤں والوں سے کہہ دو کھاری پانی کا کنواں
پاٹ دیں۔ میرے باغ بغیچے، کھیت کھلیان، کنواں، اس کا میٹھا پانی سب تم لوگوں کے لئے ہے۔ آج سے
کھاری پانی تم لوگوں کو صرف اِن دو آنکھوں سے ملے گا، جو کسی مصرف کا نہیں، جو......
دینو مائی نے اُن کی بات کاٹ کر اُن کے آنسو اپنی انگلیوں پر موتیوں کے مانند سنبھال لئے۔
”نہیں بڑی بیگم الیامت بولو ۔۔۔ یہ کھارا پانی بے مصرف نہیں یہ پانی تو وہ پانی ہے بی بی جس
سے دل کی کھیتی سیراب ہوتی ہے، جس سے دل کی بنجر دھرتی پر پھول کھل اُٹھتے ہیں، جس سے ....“
اور اس کی اپنی آواز کھارے پانی کے سمندر میں ڈوب کر رہ گئی۔

پُوجا کا مان

موتی زور زور سے ڈکرا رہی تھی۔

گوری کو ہر چیخ کے ساتھ اپنا دل باہر نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا کا تھامے کھمبے کے پاس کھڑی تھی۔ شمبھو ہنس کر بولا۔

"گائے کے لئے اتنا جی کڑھاتی ہے ری" ــــ گوری موتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔" انسان جنور سب کی تکلیف برابر ہوتی ہے۔ جیو تو اُس کے بھی ہے۔ ہائے رام کیا تڑپ رہی ہے؟

"تُو تو بھول بھکر کرتی ہے ــــ دیکھ سانجھ تک بھگوان تیرے دوارے ایک سندر سی بچھیا بھیجتے ہیں۔ اچھا یہ بتا پوسی پہ کھلانے کتنے جنوں کو نیوتا دے گی؟"

گوری چڑ گئی "تمہیں تو نیوتے کی پڑی ہے میں کہتی ہوں بے چاری اپنی جان سے نہ جائے۔ پہلا بچھڑا ہے!"

"تیرا بھی تو پہلا بچھڑا تھا کبھی ــــ بھول گئی کیا؟ ایسے ہی ڈکرا رہی تھی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنا کہا سنا ایسے معاف کرا لی تھی۔ جیسے مر ہی تو جائے گی اور پھر جب سوہنیا پیدا ہو گئی تھی تو کیسی کھِلس تھی۔ ساری تکلیفوں کو بھول بھال کر ٹکر ٹکر تاکتی پڑی تھی اس کو۔" شمبھو موتی کے درد سے بے نیاز، پچھلے جیون کی خوشیاں الٹ رہا تھا ــــ گوری کو بڑھاپے میں بھی لاج آ گئی۔

"کیا مورکھ ہے۔ اِس سمے میرا پہلا بچھڑا یاد دلانے کا کون موقع تھا؟"

شمبھو ہنس پڑا۔ "یہی تو میرا کہنا ہے کہ تکلیف سبھی کو ہوتی ہے جنور کو بھی انسان کو بھی۔ پر مرتا کوئی

نہیں"

موتی تڑپ کر زور سے ڈکرائی۔ پچھلے کو ٹھے پر بندھے بیل نے چارا کھاتے کھاتے گردن گھما کر موتی کی طرف دیکھا۔ شمبھو کو پھر دل لگی سوجھی۔

"دیکھتی ہے گوری ــــ بے چارا کھانا بھی بھول گیا۔ کیسے پلٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے"۔ ــــ گوری چڑ گئی: "ہاں ہاں اب تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہی موتی ...... اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ لاج سے اس کا بوڑھا منہ تمتما اٹھا.... شمبھو کچھ سمجھ کر مسکرا دیا۔

"تو پھر اور کیا بات ہے؟ ــــ اب بھلا وہ دوسرا بیل کیوں نہیں دیکھتا موتی کی طرف"..... موتی دھڑام سے زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔

"بھول دل لگی کرتے کھڑے ہو۔ میں کہتی ہوں تمہیں کچھ بھی درد نہیں ــــ جا کر کسی کو بلا لاؤ ذرا"۔ گوری شمبھو کو تقریباً ڈھکیل کر بولی۔ اب شمبھو کے چڑنے کی باری تھی۔ جھلا کر بولا۔

"تیرے بھیجے میں ذرا اکل نہیں گوری۔ کیا وہ بھی کوئی استری ہے کہ اس کی جنائی کے واسطے دائی کو بلا لاؤں"

"ارے سن ــــ میرے پاس درگاہ کے بڑے پیر کا تاویج ہے۔ مجھے سکینہ نے دی تھی۔ جنور انسان کسی کو بھی تکلیف ہو سب کو اس سے پھائدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے گلے میں لاکر باندھ دیتی ہوں۔ بھگوان تکلیف میں کچھ تو کمی کریں گے ہی"۔ اور وہ کوٹھری کی طرف لپک پڑی۔

بازو کے جھونپڑے سے رام داس اپنے بیلوں کو ہنکاتا ہوا نکلا۔ شمبھو کو کھڑا دیکھ کر بولا: "ارے بھائی ایسے پریشان پریشان کاہے کھڑے ہو جی؟"

"ارے کچھ نہیں دادا۔ موتی صبح سویرے سے تڑپ رہی ہے، مگر میری گھر والی اس سے بھی جیادہ تڑپ رہی ہے جیسے موتی کی نہیں خود اسی کی جنائی ہو۔ میرا بھیجا چاٹ رہی تھی کہ کسی کو بلا کر لا۔ اب اندر سے پیر صاحب کا تاویج لانے گئی ہے۔ کہتی تھی اس سے سب کی تکلیف دور ہو جاتی ہے"۔ اتنا کہہ کر شمبھو زور سے ہنس پڑا۔ مگر رام داس سنجیدگی سے بولا۔

"ارے بھائی ہم تم ان عورتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے دل میں کتنی ممتا بھری پڑی ہے ــــ

دیکھنا جب تک موتی بچہ نہ جن لے، بھابھی منہ میں دانہ بھی نہ ڈالے گی۔ اور پھر یہ بھی تو سوچو کتنے ارمانوں سے اس نے موتی کی کھرید کی۔ بچے کے سمان اس کا کھیال رکھتی ہے۔ اب اگر اس کی تکلیف پر وہ جی نہ کڑھائے تو کیا کرے بیچاری ــــ اور بھائی جانی کی تکلیف کا درد ہم مرد کیا جانیں؟"

کوٹھری سے تعویذ لے کر گوری باہر نکلی تو رام داس اپنے بیلوں کی رسی تھامے کھڑا تھا۔ گوری نے ایک ہاتھ لمبا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔

رام داس ہنس کر بولا۔" بھابھی پیوسی کھانے جرور آؤں گا سانجھ کو۔"

گوری نیچی نگاہ کئے بولی۔" ارے دادا تم سے الگ کون پیوسی کھائے گا بھلا ــــ؟ مگر پہلے اس بیچاری کی تکلیف دور ہو جائے جرا۔"

گوری نے درد سے تڑپتی چلاتی موتی کے گلے میں تعویذ باندھنے کے لئے ہاتھ بڑھائے تو اس کے آنسو ٹپک پڑے، اس نے تعویذ کی ڈوری میں گانٹھ لگاتے ہوئے من ہی من میں منت مانگی۔ بھگوان! میری موتی کی تکلیف دور کر دیں اور اس کی جان بچ جائے تو میں پیچھے والی والوں کے پرانے مندر میں لے جاکر اس کے سیندور لگاؤں گی اور دو سیر دودھ سے بھگوان کی مورتی نہلاؤں گی۔

گوری کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر شمبھو کا من پگھل گیا۔ رام داس لوجھل اور بھاری بھاری قدموں سے بیلوں کو ہنکاتا چلا گیا۔ عورت اتنی دردمند ہو سکتی ہے کہ جانوروں کی تکلیف پر بھی آنسو بہا لے؟ یہ انھیں معلوم نہ تھا۔ عورت کا یہ روپ آج تک ان دونوں کی آنکھوں سے مخفی تھا۔ شمبھو دل لگی بھول بھال کر حیرت سے گوری کو دیکھ رہا تھا۔ اور رام داس کے دل میں بھابھی کے لئے عقیدت اور عزت کا ایک دریا موجیں مارنے لگا تھا۔

سانجھ ہوتے ہوتے پورے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ شمبھو دادا کی گائے نے بچھیا جنی ہے۔ گوری کے مانو زمین پر پاؤں نہ ٹکتے تھے۔ وہ کبھی تو موتی کی پیٹھ سہلاتی کبھی بچھیا کے منہ پر ہاتھ پھراتی۔ سوہنیا، راجو، اور چھمی تھان پر سے ہٹتے نہ تھے۔ گوری کو خوش اور مطمئن دیکھ کر شمبھو بھی خوش ہو رہا تھا، مگر گوری کی خوشی سب سے بالاتر تھی۔ وہ یکساں موتی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہی تھی، موتی اپنی سیاہ اور بڑی بڑی خاموش آنکھوں سے گوری کو دیکھ رہی تھی، اس کی نگاہوں میں ہمدردی تھی، شکر مندی کا

احساس تھا اور پھر وہ نگاہیں پھیر کر اتنی محبت سے بچھیا کو دیکھتی کہ گوری کا اپنا دل مامتا کے جذبات سے بھر جاتا۔ پہلے پہل ماں بننے کا جو احساس موتی کی نگاہوں سے چھلک رہا تھا وہ گوری سے چھپا نہ رہ سکا، وہ پلٹ پلٹ کر کوٹھے پر کھڑے بیل کی طرف یوں دیکھتی مانو کہتی ہو۔

"اب میں بھی ایک ماں ہوں۔ میرے تھنوں سے بھی دودھ کی دھاریں پھوٹ پڑی ہیں، تم اگر کھیت میں ہل چلاتے ہو تو کیا میں تمہارے بچے کو نہیں پالتی؟"

گلابی پھولوں کی رنگین چنریا اوڑھ کر گوری محلے ٹولے والوں کو پیوسی کھانے کا نیوتا دینے چلی تو جہاں جاتی تو لوگ یوں بدھائی دیتے لگتے گویا موتی کو بچھیا نہ ہوئی، بلکہ گوری کی اپنی لڑکی کو بیٹی پیدا ہوئی ہو۔ اور یوں بھی گوری موتی کو سوہنیا اور بچھی سے الگ کہاں سمجھتی تھی، اور آج تو وہ ایسا محسوس کر رہی تھی، گویا پہلی بار وہ "نانی" بن گئی ہو۔ اگر سوہنیا کو بیٹی ہوتی تو بھی وہ اتنی ہی خوش رہتی۔

راہو کا کا نے پوچھا۔ "بھابھی بچھیا کس پر گئی ہے باپ پر کہ ماں پر"

گوری جھینپ گئی۔ "ارے کا بات کرتے ہو کاکا۔" پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر بولی۔ "بالکل موتی جیسی ہے۔ ویسا ہی سفید سفید روئی کے گالے جیسا بدن۔ ویسی ہی کالی آنکھیں، ہاں آنکھوں کے بیچ ماتھے پر ایک بھورا سا دھبہ بھی ہے۔"

کاکی نے دل کھول کر آشیرواد دی، "بھگوان تیرا تھان بھرا پرا رکھیں۔ ہم کسانوں کی جندگی تو جانوروں ہی کے دم سے ہے اور پھر گائے ہو تو بات ہی کیا ہے۔ اری بھابھی بڑی بھاگیہ وان ہے تو پہلے ہی بھت میں بچھیا پائی، گوری کا دل خوشی سے اچھلا جا رہا تھا۔

سکینہ کے گھر پہنچکر گوری نے دعاؤں کا طومار باندھ دیا۔ "بہن تو ہوتی نہ آج میری موتی بچتی۔"

"اے ہے کیا ہو گیا تھا؟" سکینہ سوپ پٹخ جلدی سے آئی۔

"کچھ نہیں ہوا ری، موتی نے بچھیا جنی ہے۔ مگر بیچاری ——"

سکینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اے بہن مبارک ہو۔"

دوسرے کونے سے فاطمہ چلائی۔ "سو ہمیں پیوسی کھلانے نہ بلاؤ گی؟"

گوری زور سے ہنس پڑی۔ "ارے کونے میں بیٹھی بیٹھی کیا چلا رہی ہے سامنے تو آ۔" پھر سکینہ سے بولی،

میں تو سمجھی کہ گئی ہاتھ سے پہاڑ جیسی گائے۔ مگر اللہ کا بڑا بھلا تھا سکینہ! تیرے پیر جی کے تاویز سے ساری تکلیف دُور ہو گئی ــــ تاویز باندھتے ہی ......" اور فاطمہ کو آتا دیکھ کر موسی کا لہجہ دھیما پڑ گیا ــــ

"موسی تم بڑی خراب ہو۔ رات کو چھپا ہوئی اور اب نیوتا دینے چلی آرہی ہو" اس کی معصوم شکایت پر گوری مسکرائی۔

"ارے بیٹا یہاں تو ــــ مرنے بھر کی بھی پھرست نہ تھی۔ ایسی پھکر تھی میرے کو کہ ــ"

فاطمہ نے اس کی بات کاٹ دی "تمہیں فکر تھی تو سوہنیا یا نجمی کو بھیج دیتیں"۔

بڑھیا محجوب ہو گئی۔ لاجواب ہو کر بولی۔ "اچھا، چل چل۔ اب تم تینوں ملکر ہی پیوسی بنانا۔ بوڑھے لوگ اگر کوئی گلتی کر بھی دیں تو بچے ماپھ کر دیا کرتے ہیں"۔

گوری اور شمبھو میں کھٹ پٹ چلی آرہی تھی۔ شمبھو کہتا تھا دودھ تو اتنا اترا نہیں اور تائی کھشمی کے سارے گاؤں کو نیوتا دے آئی ہے۔ گوری کا کہنا تھا کہ دوسرے دن کی گائے کو بھلا اترے گا کتنا۔ دودھ ملاکر بڑھا لیں گے پیوسی۔ اب اتنے لوگوں کو کہہ چکی ہوں تو ٹال تو نہیں سکتی"۔

باہر تینوں لڑکیوں نے مل کر جھاڑ جھوڑ کر گوبر سے لیپ پوت کر صاف ستھری جگہ بنا دی تھی۔ دروازے پر آم کے پتوں اور گیندے کے پھولوں کی لڑیاں باندھ دی تھیں۔ فاطمہ اور سوہنیا ہم عمر تھیں۔ کام کرتے کرتے مذاق بھی کرتی جاتیں۔ سوہنیا کہہ رہی تھی۔

"اب یہ پاجامہ کرتا چھوڑ کر ساڑی پہننا شروع کر دے بھا تما؟"

ڈھیلا ڈھالا کالی وائل کا کرتہ اور لال لٹھے کا پاجامہ پہنے، سر پر چھوٹی سی اوڑھنی ڈالے وہ کوٹھے کے باہر پانی چھنٹینے میں مصروف تھی۔ گھڑے کے بوجھ سے اس کے صحت مند لال لال گال دمک گئے تھے۔ اور پسینہ کی ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر جم گئی تھیں۔ کرتہ سے پسینہ کی بوندیں پونچھ کر وہ مسکرائی: "کیوں بھلا ــ کیا میں اچھی نہیں دِکھتی کرتے پاجامے میں؟"

سوہنیا بھی مسکرائی۔ "اونہوں ــــ ایسا تھوڑے ہی کہتی ہوں۔ کھالا کہہ رہی تھی۔ چاندی پورہ

سے تیری سگائی والے آ رہے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں لڑکی کے لئے چڑھاوے میں ساڑی بولکا لائیں گے۔

فاطمہ شرم سے لال ہوگئی ۔ "تیری سگائی والے آئیں گے تو میں بھی تجھے چڑاؤں گی ! اتنا یاد رکھ یہ"

سوہنیا زور سے ہنسی " اری میں چڑاتی کہاں ہوں تجھے ۔ تیرے ہی بھلے کی کہہ رہی تھی ــــ میری سکھی کو اس میں بڑا مجا آئے گا جب دولہا اپنے ہاتھوں سے ساڑی پہنادے گا۔"

فاطمہ سوہنیا کے پیچھے لپکی ... تبھی ماں آکر بولی ۔

" ماں کہتی ہے سارے محلہ والے آگئے اور تم دونوں نے اب تک سیوسی آگ پر بھی نہیں چڑھائی

ہنسی مذاق میں دونوں اس کام کو تو بھول ہی گئی تھیں ۔ سارے مہمانوں کے سامنے سے ہوتے ہوئے جب دونوں تھان پر پہنچیں تو گوری انھیں دیکھتے ہی پیار بھرے غصّے سے چڑچڑائی ۔

"کیوں ری بھاتو ــــ گھر تو بڑا دکھاتی تھی کہ موسی نے بلائی نہیں ۔ اسی لئے تو نہیں بلاتی کہ سارا کام چوپٹ کردیتی ہے آکر ۔ اب یہ کوئی کھیلنے کا بکھت ہے" فاطمہ زور سے ہنس پڑی ۔

سوہنیا بڑبڑائی " اب رہنے بھی دو ماں ۔ اگر ایک دن کام نہ کریں تو سارا گھر کھانے کو دوڑتا ہے۔ دو گھڑی ہنس کھیل لیا تو کیوں چڑتی ہو "

" سسرال جاکر ایسی ناک بتانا پھر پتہ چلے گا ۔ یہ تو میکہ ہے کوئی کچھ نہ بولے گا ۔"

سسرال کا نام سنکر دونوں کو ہنسی آگئی ۔ سوہنیا فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے چوکے میں گھس گئی ۔

" ساون کی چڑیاں ہیں یہ چھوکریاں بھی ۔ دو چار دن رہیں گی پھر سے اڑ جائیں گی ۔ مارو پیٹو گالی دو ، تب بھی کچھ نہ بولیں ! سچ ہے گائے میں اور چھوکری میں کوئی انتر نہیں ۔ آج گھر بار چھوڑ کر چلی جائیں تو یہی گھر کاٹنے کو دوڑے گا ، گوری کا دل بھر آیا ۔

شنکر اور گوری کھانے کو نہیں بیٹھے ۔ سب کو پروستے ہی رہے ۔ عورتوں کو پروسنے کا سارا بار فاطمہ اور سوہنیا نے اپنے سر لے لیا ہنستی جاتیں اور پروستی جاتیں ۔

گوری کو رام داس نے آواز دی " بھابی تم بھی آبیٹھو ہمارے ساتھ تو مجا دونا ہوجائے ۔"

گوری مسکرائی ۔" بھگوان نہ کرے مردوں کے سنگات بیٹھ کر چپڑ چپڑ منہ چلاؤں ۔ اتنی عمر ہو گئی ۔ آج تک تو نہیں بیٹھی "۔

رام داس سمجھ گیا، بولا " بھائی تمہاری گھر والی سچ مچ لکشمی ہے ۔ بھاگ پھر جائیں جس کے بھی ایسی عورت ملے ؟"

پان اور بیڑی کا دور چلنے لگا تھا ۔ ہنسی مذاق ہی ہو رہا تھا ۔ بچے کھا پی کر اودھم مچانے لگے تھے ۔ رام داس کی گھر والی نے اندر سے آکر ایک موٹے موٹے دانوں کی مالا سب کو دکھائی " یہ میں میلے سے خرید کر لائی تھی، اتنی خوبصورت مالا موتی کی بچھیا ہی پہن سکتی ہے دوسرا کوئی نہیں" اور اس نے ہاتھ اونچا کر کے بھری محفل کو مالا دکھائی ۔ جنگلی بیروں کے اتنے بڑے بڑے، ہرے لال پیلے، موتیوں کی مالا تھی ۔ یہ میلوں میں گایوں، بیلوں، کے لیئے خاص طور پر بیچی جاتی ہیں ۔ گوری شکر مندی کے طور پر مسکرائی ۔

" کوئی بچھیا کو اٹھا لاؤ، میں اپنے ہاتھ سے پہناؤں گی ؟" کلّو اٹھ کر بھاگا اور دونوں ہاتھوں میں بچھیا کو اٹھا لایا ۔ رام داس کی گھر والی نے ہاتھ بڑھا کر مالا اس کی گردن میں ڈال دی ۔" نام رکھنے کا حق مالا پہنانے والے کو پہنچتا ہے ۔ اس کا نام بھی میں ہی رکھوں گی "۔

شمبھو ہنس کر بولا :" بھابی ! تیرے کو بیٹا ہو گا تو اس کا نام میں اپنی پسند سے رکھوں گا "۔

رام داس جھینپ گیا ۔ بھابھی بھی شرما گئی ۔" بوڑھے ہو گئے پر مذاک کی عادت نہیں گئی تمہاری "۔

" ارے بھابھی تو کیا سمجھتی ہے کہ میرا بال پک ......"

ابھی شمبھو کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی ۔ کہ اکدم باہر سے رامو دوڑتا ہوا آیا ۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی ۔ وہ باہر کی طرف اشارہ کر کے بولا ۔

" باپو ! جمین دار کا آدمی آیا ہے "۔

ہنستے مسکراتے چہروں پر گویا اوس پڑ گئی ۔ شمبھو گھبرا کر بولا ۔

" جمین دار کا آدمی "۔

" ہاں باپو ! جمین دار کا آدمی آیا ہے کہتا ہے تمہاری بچھیا لے کر جائیں گے "۔

سب چہرے فق ہو گئے۔ شمبھو نے بھابی کے پاس سے اٹھا کر بچھیا گوری کے ہاتھ میں دیدی۔

"لے اسے موتی کے پاس چھوڑ دے۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیا معاملہ ہے آخر۔"

گوری کا دل کانپ رہا تھا۔ "کیا بچھیا دو گے اپنی"؟

"تو کچھ سمجھتی تو ہے نہیں۔ پھجول ٹائیں ٹائیں کرتی ہے۔ جمیندار جی سے ٹکر لے گی کیا؟" —

شمبھو کمزور دل کا آدمی تھا۔ ذرا سے دباؤ پر اکدم ہار مان لیتا تھا۔

گوری نے بچھیا کو سینے سے بھینچ لیا۔ اس کی ماتا جاگ اٹھی تھی۔ "اتنے دلوں کی آسا پوری ہوئی ہے ہماری۔ جمیندار کا کیا ہے۔ ہجاروں گیاں ہیں اس کے پاس، ہم گریب آدمی ہیں ہمیں ستا کر کیا ملے گا اسے۔"

شمبھو نے ناگواری سے اسے گھورا اور باہر نکل گیا۔

گوری نے بچھیا کو موتی کے پاس بٹھا دیا۔ موتی اکدم اسے محبت سے چاٹنے لگی۔ گوری نے بچھیا کا منہ موتی کے تھن سے لگا دیا۔

بچھیا ہر قسم کے خطروں سے لاپرواہ چسر چسر دودھ پیئے جا رہی تھی۔ موتی کتنی مطمئن تھی۔ سب!! — گوری کے آنسو بھر آئے۔ وہ ایسا انیائے کبھی نہ ہونے دے گی، ہائے یہ بچھیا چلی گئی تو موتی کے تھن اکڑ کے نہ رہ جائیں گے۔

شمبھو اندر آیا تو اس کا منہ اترا ہوا تھا۔ "کیا کہتا ہے جمیندار کا آدمی؟" کئی آوازوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"ہم نے پوجا کا مان نہیں دیا تھا اسی کا بھگتنا ہے یہ۔"

"گریبوں سے جبردستی مان لے کر پوجا چڑھائی جائے تو بھگوان بھی کھس نہیں ہوتے۔" بھابی بگڑ کر چلائی۔

ماتا دین وہیں بیٹھا بیڑی کا کش لے رہا تھا، صلح کے انداز میں بولا "ارے بھائی مگر پوجا کے مان میں بچھیا کا کیا دکھل؟"

شمبھو نے بے بسی سے آسمان کی اور دیکھا — "یہ تو بھگوان ہی جانیں مگر اتنا تو ہیں

بھی دیکھا تھا، کہ موتی کا بھن تھی تبھی سے اس پر بڑے لوگوں کے" دانت تھے "۔

سکینہ بولی ۔۔۔ " پوجا کا مان ہی تو دینا ہے نا ۔۔۔ یہ جواری کا تھیلہ بھرا رکھا ہے اٹھا کر منہ پہ مارو ۔۔۔ کھلالو جتنا کھلانا ہے پجاریوں کو "۔

گوری بولی " بہن ! گسّے میں اکل گائب ہو جاتی ہے ۔ بھلا جمیندار جوار کیا کرے گا۔ اسے دھان یا گیہوں ہونا تھا۔ اور جوار لے بھی لے تو ہم کیا بھوکوں مریں گے ۔ اتنی ہی تو جواری باکی رہ گئی ہے "۔

سکینہ چپ رہ گئی، اس کا بس چلتا تو زمیندار کا منہ نوچ لیتی ۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر بولی۔ " گوری میرے گھر دھان کا ایک بورا رکھا ہے۔ ویسے تو بیچنے کو رکھا ہے مگر اس کی وجہ سے تیرا تھان سونا ہونے سے بچ جائے تو کیا بات ہے۔ اگر زمیندار کا آدمی مانے تو وہی دیدیں گے "۔

گوری کا دل چاہا سکینہ کے پیر چوم لے۔ خوش ہو کر بولی " مگر جمیندار کا آدمی مانے تب نا؟"

" تو پوچھ کیوں نہیں لیتے ۔ جاؤ بھیا رام داس پوچھ آؤ کہ دھان لے لو گے "؟

زمیندار کے آدمی نے پھٹکار دیا " حضور کا حکم یہی ہے کہ بچھیا لے آؤ ۔ میرے ہاتھ کی بات نہیں کہ بچھیا کے بدلے دھان لے جاؤں اور نوکری گنوا بیٹھوں "۔

رام داس ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ مگر اس وقت وہ بھی ٹھنڈا نہ رہ سکا ۔۔۔ " اور اگر بچھیا پیدا ہوتے ہی مر جاتی تو کیا لیتے جمیندار جی "؟

" میں نے کہہ دیا نا مجھے نہیں معلوم، ہم خود نوکر ہیں جو حکم ملے گا اسے بجا لائیں گے ۔ پہلے سے مان دیتے تو کاہے کو یہ آفت آتی، تم لوگوں کو خود گھر لٹانے میں مزہ آتا ہے ۔ سب کے پاس پیسے تھے ۔ شمبھو پر کہاں کی غریبی لوٹ پڑی تھی ۔ سب معلوم ہے، سالے گھروں میں اناج چھپا چھپا کر رکھتے ہیں "۔

" بس بہت کہہ چکے ۔ بچھیا نہیں ملے گی "۔

وہ زہر خند ہنسی ہنسا ۔ " تم یہ بھول رہے ہو کہ تم کس سے بات کر رہے ہو "؟

رام داس سنبھلا ۔ " حجور ہمارے مائی باپ ہیں ۔ آپ کھود سوچئے کہ بچھیا بنا گائے کیسے جندہ رہے گی ؟ "۔

"تو گائے بھی ساتھ کر دو" ۔ (پلان پہلے ہی سے بنا بنایا تھا)

رام داس سناٹے میں آ گیا ۔

گوری نے چھاتی پیٹ لی۔ "کیا انیائے ہے بھگوان ۔ گھر کی لکشمی پر ہی آفت آئی"۔

شمبھو ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا ۔ "مجھے تو کچھ نہیں سجھائی دیتا بھائی"۔

"تمہیں سجھائی نہیں دیتا پر مجھے تو سجھائی دیتا ہے۔ کون ماں کا لال ہے بچھیا یا گیا کو ہاتھ تو لگا لے جرا؟"

شمبھو نے گوری کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "گوری، بھگوان کے لئے چپ رہ جا۔ کس سے ٹکر لینے چلی ہے۔ آج جمیندار بے دکھل کر دے تو دانے دانے کو ترسیں گے۔ جانے دے بچھیا اور گیا دونوں کو بھی۔ مالوم ہے کہ انیائے ہے مگر صبر کر لے۔ بھگوان کھد جالم سے بدلہ لے لے گا"۔

گوری چلائی۔ "اتنے دنوں سے میں نے پال پوس کر اولیاد کے جیسا بڑا کیا۔ اب انہیں الگ کر دوں"۔ پھر سب عورتوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ "اپنے بچے کو کوئی ماں کبھی چھوڑ سکتی ہے۔ موتی میرا بچہ ہے، میرے کلیجہ کا ایک ٹکڑا ہے۔ اور بچھیا میرے کلیجے کے ٹکڑے کا ایک ٹکڑا ہے، میں کسی کو بھی الگ نہیں کر سکتی۔ موتی تو مر جائے گی چلا چلا کر۔ اس کی گیلن[1] کیسے پھڑ پھڑائے گی میرے بھگوان"۔

سب چپ چاپ تھے اور ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ زمیندار کی ناانصافی ہے۔ بھلا دودن کی بچھیا بھی کبھی گائے سے الگ کی جا سکی ہے۔ مگر انصاف کرنے والا کون تھا؟

بھابھی بولی۔ "وہی تو میں کہوں کہ پوجا کا مان لیتے ہمیں پورے گاؤں پر دباؤ پڑا، نہیں پڑا تو شمبھو دادا پر۔ تبھی سے گا بھن گائے آنکھوں میں تھی، سوچ لیا ہوگا کہ اب کا بدلہ تب نکال لوں گا اور وہی ہو کر رہا۔ گائے بھی تو کیسی عمدہ ہے۔ کتنے کی بچھیا کھڑی تھی شمبھو دادا سے کھلا پلا کر کیا گائے اٹھائی ہے کہ واہ"۔

"دو بیسی اور پانچ میں"۔ شمبھو مری ہوئی آواز سے بولا۔

---

[1] کوکھ

اتنی اچھی گائے بھلا وہ کسائی چھوڑنے والا تھا۔ اب تو اس کے من کی مراد پوری ہونے کا بکھت آیا ہے۔ دیکھ لینا۔ بچھیا کے بہانے گائے بھی ہاتھ صاف نہ کر لے تو میری چوٹی مونڈ ڈالنا"۔

زمیندار کی اس قسم کی کارستانیوں سے سب باخبر تھے۔ کوئی کچھ نہ بولا۔

"ارے لاتے ہو بچھیا یا گر میں ہی اٹھاؤں"۔ محفل میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔

"میں کیا کروں بھگوان"۔ شمبھو بے لسبی سے پکارا۔

"پھکرمند کیوں ہوتے ہو بھائی"۔ چلو سب مل کر جمیندار جی کے پاس پھریاد کریں گے۔ کیا کھبر بھگوان دل میں دیا ڈال دیں اُن کے"۔ رام داس بولا

شمبھو کے منہ پر رونق آگئی۔ بیج زمین کے اندر ہی اندر جل رہے ہوں بارش کی کوئی آس نہ ہو، اس سمے بادل گھر کر آجائیں تو بارش ہو یا نہ ہو کالے بادلوں کو دیکھ کر کسان کی روح خوش ہو جاتی ہے کہ اب بادل تو چھا ہی گئے بارش بھی ہو ہی جائے گی۔ یہی آس اس وقت شمبھو کے کے دل پر کالا بادل بن کر چھا گئی۔ خوش ہو کر بولا۔

"بھائی یہ بات تو کھوب کہی تم نے۔ کون جانے بھگوان دل میں دیا بھر دیں، جا کلو، بچھیا اٹھالا"۔

"اب۔ بچھیا کو لے جانے کا کون کام ہے"۔ گوری چلائی۔

"جمیندار سے پہلے تو اس کا آدمی ہی جندہ نہ چھوڑے گا۔ بچھیا تو ساتھ لے جانا ہی ہوگا اگر مان گیا تو واپس لے آئیں گے، ورنہ پھر تو دینا ہی پڑے گا"۔

"ہاں ہاں پھر تو دینا ہی پڑے گا"۔ گوری غصہ سے چیخی۔ "کیسے مورکھ ہو تم"۔

"جا کلو۔ بچھیا اٹھالا"۔ شمبھو گوری کی بات کو نظر انداز کر کے بھاری آواز سے بولا۔

ابھی مالا پہنانے کلو کیا خوشی خوشی بچھیا کو اٹھا لایا تھا۔ اب اس کے قدم نہ اٹھتے تھے۔

شمبھو اس کے دل کی حالت بھانپ گیا۔ دردآمیز مسکراہٹ سے بولا۔

"بیٹیوں کو بھی تو کبھی نہ کبھی بدا کرنا پڑتا ہے کلو بھائی۔ ایسا سمجھ لو آج اپنی بیٹی بدا ہو رہی ہے"۔ کلو کی آنکھیں بھر آئیں۔

گوری دوڑ کے کھونٹے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھیں بری طرح برس رہی تھیں۔ سب عورتیں دم سادھے کھڑی تھیں۔ شمبھو نے بڑی ہمت سے بچھیا کو دبلی اٹھائی۔

"کلّو دادا تم میرا کلیجہ نکال کرلے چلے ہو۔"

کلو کا من کانپ اٹھا۔ اس نے بچھیا کو زمین پر بٹھا دیا۔ اور دوڑ کر باہر نکل گیا۔ شمبھو بھائی، "وہ بھرے گلے سے بولا" یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔"

ایک عجیب سی اداسی پورے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ گوری کے آنسو بہے جا رہے تھے اور وہ پوری کی پوری کانپ رہی تھی۔ شمبھو کے قدم جہاں کے تہاں گڑے رہ گئے۔ وہ جی کڑا کر کے بولا۔ "گوری یہ سمجھ لے کہ آج تیری بیٹی کی بدائی ہے۔" گوری کچھ نہ بولی۔ آنسوؤں کا ایک اور ریلا اس کا چہرہ دھو گیا۔

"رام داس! تم ہی اٹھالو بھائی۔ میرے تو ہاتھ نہیں اٹھتے۔"

رام داس نے بچھیا کو اٹھالیا۔ وہ قدم چلا ہوگا کہ موتی تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور رسّی سمیت بچھیا کی طرف لپکنے لگی۔ اس کی خاموش اور بے زبان آنکھوں نے آنے والے خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ بے کسی سے بچھیا کو دیکھ رہی تھی، رام داس لڑکھڑا گیا۔

"شمبھو بھائی! اس بے جان کی تڑپ مجھ سے نہ سہی جائے گی۔ دیکھتے نہیں اس کی آنکھوں کو کیسی بے کسی سے ٹکر ٹکر تاک رہی ہے؟"

شمبھو منہ سے کچھ نہ بولا۔ اس نے آگے بڑھ کر موتی کی رسّی کھول لی "چلو، اس کو بھی لے چلیں۔"

گوری اب تک چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بری طرح برس رہی تھیں۔ مگر اب وہ چپ نہ رہ سکی۔ اکدم وہ شمبھو کے پیروں پر گر پڑی "تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ میرا گھر سونا نہ کرو ناتھ، تم نے بیاہ منڈپ میں کہا تھا۔ جیون بھر میرا دل نہ توڑے گے آج سارے جیون کا بدلہ چکا دو۔ آج اپنی بات کی لاج رکھ لو۔ میرا دل نہ توڑو۔ میرا تھان سونا نہ کرو ناتھ"

اور وہ پچھاڑیں کھانے لگی۔ شمبھو کا من کانپ اٹھا اور بالکل پہلی بار، باوجود ضبط کی کوشش کے اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے ۔۔۔

شمبھو نے رسّی چھوڑ کر گوری کو سنبھالا۔ "تو میرا دل بھی چھوٹا کئے دیتی ہے گوری۔ ابھی واپس لے آتا ہوں بچھیا اور گیا دونوں کو بھی۔"

رام داس کے پیچھے پیچھے شمبھو گائے کی رسّی تھامے نکلا۔ باہر اچھا خاصہ ہجوم ہو رہا تھا۔ سب زمیندار کی حویلی جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ گوری کے آنسوؤں نے سب کے دلوں میں ہمّت بھر دی تھی۔ زمیندار کا آدمی اتنے سارے آدمیوں کو چلنے پر آمادہ دیکھ کر دل ہی میں مسکرایا (زمیندار جی ضرور تمہاری فریاد سُن لیں گے ـــ نادان لوگ!)

ایک ایک دو دو کر کے لوگ جمع ہوتے جا رہے تھے۔ عورتیں چپ چاپ کھڑی ہجوم کو آگے بڑھتا دیکھ رہی تھیں کہ اتنے میں پھر گوری دوڑتی ہوئی آئی۔ "میں بھی چلوں گی جمیندار کے گھر۔ تمہاری پھریاد نہ سُنے گا تو میں اس کے پاؤں پکڑ لوں گی اپنے آنسوؤں سے اسکے پیر دھو ڈالوں گی تب تو مانے گا"؟

"بھابھی تمہارے چلنے کی جرورت نہیں۔ اگر میرے کو وہاں گسّہ آگیا تو پھول کھوں کھرابا ہو جائے گا۔" رام داس بولا۔

گوری بے بسی سے اُسے دیکھنے لگی۔ پھر لپک کر اُٹھی۔ بولی۔

"میں نے منت مانی تھی کہ مندر لے جا کر موتی کے سیندور لگاؤں گی مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ جرا ٹھہرا میں ابھی لاتی ہوں۔" تھوڑی دیر میں گوری دوڑتی آئی۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سیندور کی کٹوری سے چٹکی بھر سیندور نکال کر اس نے موتی کے ماتھے پر بکھیر دیا۔ "میری بیٹی آج سسرال چلی ہے۔ سُونی مانگ سے کیسے جانے دوں بھلا؟" موتی خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ سکینہ نے منہ میں آنچل ٹھونس لیا تھا پھر بھی سسکیوں کی آواز دب نہ سکی۔ فاطمہ اور موہنیا پاس کھڑی پُرنم آنکھوں سے گائے کو دیکھ رہی تھیں۔ بالکل ایسے انداز سے کہ بڑی بہن بدا ہو رہی ہے۔ اور آنسو بھری آنکھوں سے اشاروں ہی اشاروں میں جیجا جی سے کہتی ہو کہ ہماری بہن کو لئے تو جاتے ہو مگر دل نہ دکھانا اس کا۔ مگر یہ کیسی بارات تھی جس میں نہ جیجا جی تھے نہ ڈولی، نہ قہقہے تھے، نہ خوشیاں تھیں، صرف آنسو تھے، مسکراہٹ کا کہیں بھی پتہ نہ تھا۔

ـــ صرف آنسو ہی آنسو ـــ جن میں دلوں کی خوشیاں ڈوب رہی تھیں۔

"پھاطمہ بہن! میرا کلیجہ کٹا جاتا ہے۔" سوہنیا فاطمہ سے لپٹ گئی۔ "نراش نہ ہو میری سوہنیا! ابھی دادا واپس لے آتے ہیں دونوں کو بھی۔"

ہجوم آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ عورتیں سسکتی رہیں۔ بھیگی آنکھوں سے کھڑی دیکھتی رہیں۔ اور ہجوم موڑ پر سے آنکھوں سے اوجھل ہوگیا تو گوری بوجھل بوجھل قدموں سے اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔ گائے کا تھان سونا سونا پڑا تھا۔ بیل خاموشی سے چارہ کھا رہے تھے اور آنگن کے بیچوں بیچ موتی کا کھونٹا تنہا کھڑا تھا۔ گوری کا دل بھر آیا۔ وہ کھونٹے کے پاس جاکر بیٹھ گئی اور اپنی گلابی پھولوں والی چنریا میں منھ چھپاکر زور زور سے چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

(۳)

"ڈیڈی! یہ کمبخت سلام ہی نہیں کرتا بھئی۔" سروج منمنائی

"ڈیڈی! یہ کمبخت سلام ہی نہیں کرتا بھئی۔" رمیش نے سروج کی نقل اتاری۔

سروج مسلسل آٹھ دنوں سے اپنے بندر کو سلام کرنا سکھا رہی تھی مگر وہ سیکھ ہی نہ چکتا تھا۔

"دیکھ رمیش! میں تمہیں پیٹ دوں گی پکڑ کر۔ تم میری نقل کیوں اتارتے ہو بھئی؟"

"میں نے تمہاری نقل کب اتاری؟ میں تو ڈیڈی سے کہہ رہا تھا کہ یہ بندر بڑا نامعقول ہے سلام ہی نہیں کرتا۔"

"بندر میرا ہے یا تمہارا؟"

"تمہارا۔"

"تو پھر میرا بندر سلام کرے نہ کرے تم سے مطلب؟"

"تم میری بہن ہو یا نہیں؟"

"ہوں!"

"تو پھر میری بہن کا بندر سلام کرنا نہ سیکھے تو مجھے اس کی کوئی فکر ہی نہیں گویا؟"

"لیکن مجھے آپ کی فکر کی کوئی ضرورت نہیں صاحب! میں آپ نپٹ لوں گی! اپنے بندر سے تم جو اپنے کتے کو نچانا سکھار ہے تھے اس کا کیا بنا؟"

رمیش مسکرایا۔" وہ نہیں ناچ سکتا۔ تھک گیا میں تو کوشش کر کے۔"

"بالکل ناچ سکتا ہے جناب! یوں کہئیے آپ کو نچانا نہیں آتا۔"

"ہاں یوں بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اصل بات تو یہ ہے کہ نچانا کچھ لڑکیوں کو ہی اچھا آتا ہے۔ تم وہ کپور کو خوب نچاتی تھیں جھٹی۔"

سروج تڑپ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے شانوں تک کٹے ہوئے بال ایک جھٹکے سے سینے پر آگرے۔ گال تمتما گئے۔ آنکھیں غصے کے مارے پھیل گئیں۔" کیا کہا ــــ؟ ــــ میں نچاتی تھی؛ وہ آپ ناچتا تھا۔ تم اپنی بہن کو ایسا کہتے شرم محسوس نہیں کرتے رمیش؟"

وہ ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔" ارے بھئی اس میں شرم کی کیا بات ہے ظاہر ہے وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے!"

"سروج شرما گئی۔" کرنے لگے نا بیوقوفی کی باتیں۔"

"میں تم سے بڑا ہوں۔ مجھے بیوقوف نہ کہو سروج دیوی۔"

"بہت دیکھے ایسے بڑے بھائی۔"

"ممی سے کہہ دوں گا سروج مجھے بیوقوف کہتی ہے۔"

"اور میں ڈیڈی سے کہہ دوں گی رمیش مجھے خواہ مخواہ چھیڑتا ہے۔"

"تجھے لڑنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ سرجو کی بچی۔ مگر دیکھ مجھ سے لڑائی کر کے گھاٹے میں رہے گی تو!"

"کیوں بھلا؟"

"کیونکہ آج میں شہر جا رہا ہوں۔ لڑائی کرے گی تو تجھے چھوڑ دوں گا یہیں۔"

"تو یہی وجہ ہے جو مجھے ڈرا ہونگ نہیں سکھاتے تم۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔"

"تو میں ڈیڈی سے سیکھ لوں گی"۔

"بس سکھا چکے ڈیڈی"۔

"دیکھ لینا تم بھی"۔

"گاڑی ٹکرا دو گی کہیں بھی"۔

"جیسے تم نے ٹکرائی تھی نا"۔

"جھوٹ بکتی ہے تو"۔

"ڈیڈی سے پوچھوا دوں"۔

"چلو بھلا"۔

ڈیڈی اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹے سگار پی رہے تھے۔ بازو میں میز پر بہت سارے کاغذات دھرے تھے۔ وہ اس وقت کسی گہری سوچ میں ڈوبے دکھائی دیتے تھے۔ کیونکہ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ (جو صرف شدید سوچ اور پریشانی کی حالت میں بند ہوتی تھیں)

"ڈیڈی: رمیش نے اپنی شورلٹ ایک بار درخت سے ٹکرا دی تھی نا؟" سروج چلاتی ہوئی آئی۔ زمیندار صاحب نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ابھی وہ بات کی نوعیت بھی نہ سمجھ پائے تھے کہ رمیش بول اٹھا۔

"ڈیڈی، میں نے کبھی اپنی گاڑی درخت سے ٹکرائی؟"

"نہیں تو۔" وہ بے سوچے سمجھے بول اٹھے۔

"اب بتلایئے سروج دیوی؟" رمیش نے اکڑ دکھائی۔

"ڈیڈی بھول گئے ہوں گے"۔ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

زمیندار صاحب نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔ "کیا بھول گیا ری تیرا ڈیڈی"۔

"دیکھئے ڈیڈی یہ رمیش کہتا تھا کہ مجھے چھوڑ کر ....

اسی وقت ایک خدمتگار کمرے میں داخل ہوا" حضور! کسانوں کی ایک ٹولی آئی ہے۔

حضور سے ملنا چاہتی ہے۔

زمیندار صاحب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "کس لئے آئے ہیں وہ لوگ ؟" انھوں نے گرجدار آواز میں پوچھا۔

"یہ تو نہیں معلوم حضور"۔

زمیندار صاحب اور اُن کے پیچھے پیچھے سروج باہر چلی گئی۔ ملازم باہر جانے لگا تو رمیش نے اُسے روکا۔

"تمہیں نہیں معلوم کہ یہ لوگ کیوں آئے ہیں ؟" اُس نے گہری گہری نظروں سے ملازم کو دیکھا۔

صبح ہی صبح زمیندار صاحب نے شمبھو کی بچھیا منگوائی تھی۔ رمیش بیٹھک کے پاس والے اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ زمیندار صاحب کی آواز سنکر اُس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اُسے پتہ چل گیا تھا کہ ڈیڈی کیا کر رہے ہیں۔ گاؤں کی چھوٹی سی دنیا میں کوئی بھی بات آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ چاہے وہ گائے کی جننا ہو یا ہتو چمار کی لڑکی کے حرام کے بچے کی خبر ہو۔ رات ہی کو بڑی حویلی میں یہ خبر پہونچ چکی تھی کہ شمبھو کی گائے نے بچھیا جنی ہے۔ رات کے کھانے پر زمیندار صاحب اور اُن کی بیگم میں اس مسئلہ پر بات چیت بھی ہوئی تھی۔ رمیش اپنی جگہ ہونٹ کاٹتا رہ گیا تھا۔ اور صبح ہی صبح جب اپنی بات کو عملی جامہ پہنانے کو زمیندار صاحب نے اپنا آدمی شمبھو کے گھر بھیجا۔ اسی وقت سے رمیش کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ اور وہ صبح سے اپنی بہن سے لڑ لڑا کر اپنی دل کی جلن مٹا رہا تھا۔ زمیندار صاحب کے بارے میں ان کے اپنے بیٹے کی کچھ اچھی رائے نہیں تھی۔ وہ انہیں منہ پر تو کچھ نہ کہتا مگر دل میں انھیں بہت ظالم سمجھتا۔ حقیقتاً وہ تھے بھی ایسے ہی۔ آج کا واقعہ ایسا نہ تھا کہ رمیش اسے آسانی سے بھلا دیتا۔ اُس نے ملازم کو گھورا "تمہیں نہیں معلوم"

"وہ بوکھلا گیا "نہیں حضور"

"تم چھپا رہے ہو" ؟

"حضور میں غریب آدمی ہوں"

"اسی لئے تو پوچھتا ہوں"۔

وہ رک رک کر بولا "حضور بڑے سرکار نے شمبھو دادا کی بچھیا منگوالی ہے۔ حضور دو دن کی بچھیا ہے

شمبھو دادا نے پوجا کا مان نہیں دیا تھا، اسی لئے "۔

"شمبھو کون ہے؟" اُس نے بات کاٹ کر پوچھا۔

" ایک غریب کسان ہے حضور"۔

"تو اب وہ لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں"۔

"حضور...... "وہ کچھ رکا۔" وہ کچھ نہیں کہنا چاہتے اور سب کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ بچھیا پورے دو دن کی بھی نہیں ہوئی حضور اور پھر یہ بات بھی ہے کہ شمبھو کی گھروالی کو گائے سے بڑی محبت ہے۔ شمبھو بچھیا کی بھوک کے خیال سے گائے لے آنے پر بھی مجبور ہو گیا۔ اب وہ رو رو کر جان دے رہی ہے۔ حضور اصلی بات تو یہ ہے کہ کسان کی زندگی، کسان کے گھر کی رونق جانور ہی ہوتے ہیں۔ اور پھر گائے تو......"

"تمہیں یہ ساری باتیں کس نے بتائیں؟" رمیش اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی پوچھ بیٹھا۔

حضور! ہم ایک ہی برادری کے لوگ ہیں۔ ہمارے دکھ سکھ ایک ہیں۔ ہمارے جیون الگ الگ نہیں ہیں۔ میں جو چار حرف پڑھ کے بڑے سرکار کے یہاں نوکری کرنے لگا ہوں۔ تو اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ میں ان سے الگ ہو گیا ہوں۔" اور یہ بات کہہ کر خود ہی ڈر سا گیا۔ مگر رمیش نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا وہ باہر نکل گیا۔

سیڑھیوں سے نیچے کسان کھڑے تھے۔ پھٹے پرانے میلے کچیلے کپڑے پہنے۔ ہاتھ جوڑے یوں گھگھیا رہے تھے کہ پتھر بھی پسیج اٹھے۔ مگر زمیندار صاحب ٹس سے مس نہ ہو رہے تھے۔ رمیش کے دل میں ایک لمحہ کے لئے اپنے باپ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوئی۔

"ہجور ہمارے مائی باپ ہیں۔ آپ ہی نہیں سنیں گے تو پھر ہماری پھریاد کون سنے گا؟"

"تم یہ مانتے ہو کہ تم نے پوجا کا مان نہیں دیا تھا"؟

شمبھو نے سہم کر سر ہلا دیا۔

"تو پھر یہ تمہارا رونا گڑگڑانا فضول ہے۔ پوجا رک نہیں سکتی۔ مان کسی بھی صورت وصول کرنا ہے ہمیں"۔

"مگر ہجور پوجا اور بچھیا میں کیا سمبندھ ہے؟" رام داس بولا۔

زمیندار صاحب مسکرائے۔ "بچھیا کو بیچ کر پیسے وصول کئے جائیں گے۔ اس طرح تمہاری طرف سے پوجا کا مان وصول کر لیا جائے گا۔"

"حضور! میں گھر کا سامان اور بچا کھچا اناج بیچ کر مان دے دوں گا۔" شمبھو نے آگے بڑھ کر سیڑھیوں پہ سر ٹیک دیا۔

"سامان اور اناج پہلے بھی تو بیچا جا سکتا تھا۔ پھر پہلے ہی کیوں نہ دیدیا؟ اب بچھیا دیتے جان نکلتی ہے تو سامان اور اناج بیچنا سوجھتا ہے۔ مجھے تم لوگوں کی بہانے بازیاں خوب معلوم ہیں۔ بچھیا اس لئے لیتا ہوں کہ آئندہ کے لئے نصیحت ہو جائے اور مان دیتے سمے بہانے نہ سوجھیں۔"

شمبھو لاجواب ہو گیا۔ واقعی اناج پہلے بھی تو بیچا جا سکتا تھا۔

رام داس آگے بڑھ کر بولا۔ "حضور! اب کی دفعہ معاف کر دیں پھر سے ایسی غلطی نہ ہو گی۔"

مگر حضور نے جواب دینے سے زیادہ مسکرا دینا ہی بہتر سمجھا۔

رمیش کا خون کھول اٹھا۔ اس نے دھیرے سے سروج کو پکارا "شی۔ شی۔ سروج!"

کیا ہے؟"۔ وہ اس کے قریب آئی تو رمیش اسے کھینچتے ہوئے اندر لے آیا۔

"کیا ہے بھئی؟ اتنا مزہ آ رہا تھا وہاں!" وہ چڑچڑائی۔ رمیش کا دل چاہا اس کے گورے گورے گالوں پر طمانچہ لگا دے، مگر وہ ضبط کر گیا۔

"بھارت ناٹیم کا ڈانس ہو رہا تھا کیا؟ وہاں جو مزہ آ رہا تھا؟"۔ سروج کو بھارت ناٹیم بہت پسند تھا، وہ غصہ ہو کر بولی "جو کچھ بھی ہو رہا تھا مگر یہ کہو مجھے کیوں بلایا۔"

وہ نرم پڑ گیا "ایک بات کہوں؟"

"کیا ہے؟"

"پہلے یہ بتا مان لے گی میری بات؟"

"شاید!" اس نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑی۔

شاید وایذ نہیں۔ ماننا ہی ہوگا۔"

"اونہوں ـــ تو بولو تو سہی" وہ ادب سے بولی۔

"ڈیڈی تجھے بے حد پیار کرتے ہیں نا"؟

"تو پھر ــــ:"

"اُن سے میری خاطر ایک چیز مانگ لے۔"

"وہ کیا؟"

"کہنا کہ شمبھو دادا کی گائے اور بچھیا اسے لوٹا دیں۔"

"اچھا میں تمہاری خاطر کی کیا بات ہوئی ــــ تمہیں بچھیا گیا سے مطلب؟"۔ وہ بڑی حیرانگی سے بولی ــــ

"بس ایسے ہی ــــ میرا دل چاہتا ہے ایسے۔"

"اچھا دل ہے تمہارا ــــ ڈیڈی کیوں واپس کریں گے بھلا ۔ اس نے پوجا کا مان جو نہیں دیا ہے۔"

"پوجا کا مان ــــ پوجا کا مان ــــ" رمیش چڑ کر بولا۔ "جیسے دیکھو یہی گاتا ہے۔ ارے اس کا گھر کا گھر پریشان ہو رہا ہے رو رو کر اور یہاں پوجا کی پڑی ہے آپ لوگوں کو۔ بڑے مذہبی بنتے ہیں ڈیڈی۔ اتنا تو معلوم ہوگا کہ سب سے بڑی پوجا سب سے بڑی عبادت ہے غریبوں سے ہمدردی غریبوں کا دل رکھنا۔"

"سب شمبھو کی بدمعاشی ہے۔ گھر میں اناج تو موجود ہے پہلے ہی سے کیوں نہ دے دیا۔"

رمیش نے اسے گھور کر دیکھا۔ (بالکل اپنے باپ کی بیٹی تھی)، غصے سے بولا۔ "اب اگر اناج بیچ کر پوجا کا مان دے گا تو دو مہینے فاقے کریگا بے چارہ۔"

"تو پھر اناج نہ بیچے، اپنی بچھیا ہی دیدے۔ چلو ہو گئی خلاصی۔"

رمیش نے غصے سے ہاتھ مٹکا کر اس کی نقل اُتاری۔ "اپنی بچھیا ہی دیدے، چلو ہو گئی خلاصی۔ اچھا یہ بتا اگر کوئی زبردستی تیرے پالتو جانور یا تیرا بندر ہی لے بھاگے تو تو کیا کرے گی؟"۔

"منہ نوچ لوں گی اس کا۔" وہ سچ مچ ایسے غصہ ہو گئی جیسے کوئی واقعی اس کا بندر لے کر بھاگا جا رہا تھا۔

"پھر یہ بھی تو سوچ ــــ" رمیش نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا ــــ "کہ بندر سے مجھے

مالی فائدہ نہیں۔ صرف تیری دل بہلائی کا ذریعہ ہے وہ۔ اور یہاں گائے تو شمبھو کی کتنی ضرورتیں پوری ہوئیں ہیں۔"

سروج اُسے چپ چاپ دیکھ رہی تھی۔ رمیش پھر بولا۔" اور مجھے یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ڈیڈی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں میں خود دخل دیتے ہیں۔ ایک زمیندار کے بہ شایان شان نہیں یہ بات۔ مندر کے ممبر خود پوجا کا سامان وصول کرلیں گے۔ ڈیڈی کیوں خود کو بدنام کرتے ہیں؟"

"تم غلط سمجھ رہے ہو رمیش۔ اصل میں ڈیڈی انصاف پسند ہیں۔ وہ ہر بات کا فیصلہ خود اپنے ہاتھوں کرنا چاہتے ہیں۔" "اس طرح انصاف کرنے میں بھی تو مالی فائدہ ہوتا ہے میری پاگل بہن، تیرے ڈیڈی کی تجوری روز بروز کتنی بوجھل اور وزنی ہوتی جارہی ہے۔"

رمیش مسکرایا۔" خیر تو نہیں کہنا چاہتی تو نہ کہہ۔ مگر مجھے امید ہے کہ آج نہیں تو کبھی تو تو میرا ساتھ دے گی اور اسیٹے دے گی کہ میں کوئی غلط بات نہیں کر رہا ہوں۔ غریبوں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے سے، ہمدردی کرنے سے، مصیبت میں اُن کے کام آنے سے، دل کو جو خوشی ہوتی ہے اُس سے تو ابھی واقف نہیں ہے، مگر کبھی تو تیری آنکھیں کھلیں گی ہی۔ مجھ سے غریب شمبھو کی تڑپ نہیں دیکھی جاتی۔ ہم بڑے لوگ ہیں دل کھول کر غریبوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اپنی حماقت سے ہم بھول رہے ہیں کہ جنھیں ہم چھوٹا سمجھ رہے ہیں وہی ہم سے بڑے ہیں۔ چھوٹے تو ہم ہیں جو اُن کی محنت کے سہارے جی رہے ہیں۔ اگر آج کسان اناج اگانا چھوڑ دے تو کیا تیرے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے کہ صرف ایک وقت پیٹ بھر کھانے کے لئے تو کھیت جوت سکے، ہل چلا سکے، اناج پیدا کر سکے"؟

"بھیا!" سروج سہمی ہوئی آواز میں بول اُٹھی" میں ابھی ڈیڈی سے جاکر کہتی ہوں۔"

ڈیڈی بک بک جھک جھک کر کے (مگر اپنی بات منوا کے) پھر اپنے کمرے میں آبیٹھے تھے۔ گائے اور بچھیا تھان پر بندھ گئے تھے۔ شمبھو اپنی مرضی سے گائے چھوڑ گیا تھا۔ گائے بچھیا کے لئے تڑپتی، یہ اُس سے دیکھا نہ جاتا، تھوڑے دن دودھ نہ ملے گا نہ سہی، پر بے زبان کی ممتا تو تڑپنے سے بچ جائیگی۔

"ڈیڈی!" وہ زمیندار صاحب کی گردن سے جھول گئی۔" ہماری ایک بات سنیں گے؟"

"بھلا اپنی بیٹی کی بات نہ سنیں گے ہم"

"تو ڈیڈی شمبھو دادا کی بھیا واپس کر دیتے نہیں."

زمیندار صاحب چونک پڑے. "یہ بات تجھے رمیش نے سکھائی ہے کیا؟" وہ غصّہ سے بولے. اِدھر کئی دنوں سے وہ رمیش کے رویّے میں تبدیلی دیکھ رہے تھے اور کئی بار رمیش کو کھیتوں پر جاتا دیکھ چکے تھے

"نہیں تو! " وہ صاف مکر گئی." میں اپنے دل سے کہہ رہی ہوں. بیچارے کتنا روتے تھے. پھر کیا کہتے ہیں ڈیڈی آپ ؟؟"

"وہ سنبھلے ـ مسکرائے ـ پھر بولے " ہاں ـــ ہاں ـــ یہ کون بڑی بات ہے !" دیہ کون بڑی بات تھی شمبھو کا تھان اجڑ چکا تھا. گائے بھیا زمیندار جی کے گھر بندھ چکی تھی. اب بیوقوف اولاد ناسمجھی سے ضد کرے تو جھوٹا وعدہ کر لینا کون بڑی بات تھی)

رمیش اور سروج گھوڑوں پر صبح ہی صبح کھیتوں کی طرف جا رہے تھے. رمیش سفید شرٹ اور سفید ہی پینٹ پہنے تھا سر کے بال ہوا کے جھونکوں سے اڑے جا رہے تھے. صبح کی تازگی سے اس کے گال دمک رہے تھے. اور چہرہ چمک رہا تھا. سروج کے بدن پر کورڈرائے کی نیلی پینٹ تھی. بند گلے کی تنگ نیلی جرسی پہن رکھا اور نیلے رومال سے اڑتے ہوئے سنہری بالوں کو سمیٹ کر اس نے جو تھوڑی کے نیچے گرہ دے رکھی تھی. اس لباس میں وہ کوئی انگریز لڑکی معلوم ہو رہی تھی.

"سروج! تو نے اب تک صرف حویلیاں ہی دیکھی ہیں آج میں تجھے غریب کسانوں کی جھونپڑیاں دکھاؤں گا."

"اور تم نہیں دیکھو گے ؟" وہ بچوں کے معصوم انداز میں بولی.

"میں ؟" وہ ہنسا " میں تو ہزاروں بار دیکھ چکا ہوں."

سروج نے اسے حیرت سے دیکھا " ہزاروں بار ــــ مگر کہاں ؟"

"کالج سے ڈبکی مار کر بھاگ جایا کرتا تھا."

"مگر کہاں بھئی ؟"

"شہر میں جہاں میرا کالج نہیں ہے. وہاں سے دس بیس کوس پر ایک دیہات ہے ـــ ہر

گاؤں ــــ بس اپنے شیام نگر جیسا ہی ہے، وہاں پر میں اتنی بار گیا ہوں کہ میرے دل و دماغ میں بس وہی کسانوں کی زندگی رچ بس گئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہی اصل زندگی ہے ــــ میں نے وہاں ہل چلائے ــــ کھیت گوڑے ــــ بیج بوئے ــــ درانتی سے فصل کاٹی ــــ زخم بھی پائے۔ یہ دیکھو ایکبار درانتی سے انگوٹھا کٹ گیا تھا۔ مگر سروج یہ حقیقت ہے کہ ان ہی زخموں نے مجھے حقیقی زندگی سے قریب تر کر دیا ہے۔ میں نے وہاں کسان بن کر زمیندار کے ظلم بھی اٹھائے۔ جبکہ میں دھوتی پہنے کھیت میں دوسرے کسانوں کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اور زمیندار صاحب کے آدمی مجھے اور دوسرے کسانوں کو بیگار پر پکڑ لے گئے تھے۔ اتنی بیدیں پڑیں تھیں کہ پیٹھ چھل گئی تھی۔ کئی دنوں تک کروٹ نہیں لے سکتا تھا۔ اور پھر یہی واقعہ نہیں۔ میں نے ہر قسم کا تجربہ حاصل کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب زمینداروں کو دیکھتے ہی میرا جی جل اٹھتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے ــــ " وہ زور سے ہنسا۔" کہ میں خود زمیندار ہوں"۔

"سروج حیرت سے سن رہی تھی۔ بولی"۔ مگر تمہیں ہیرا گاؤں جانے کا موقعہ کیسے مل جاتا تھا۔"

یہاں تو میری زندگی کا رخ ہی بدل گیا ہے۔ دو سال پہلے ــ یاد ہوگا میں کرسمس کی تعطیلات میں گھر نہیں آیا تھا۔ ڈیڈی کو لکھ دیا تھا کہ میں یہیں رہ کر اسٹڈی کر رہا ہوں مگر دراصل میں ہیرا گاؤں میں چلا گیا تھا۔ ہرنید کے ساتھ۔ وہاں میں نے زندگی کا اصل روپ دیکھا اور پھر تو ہیرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ــ چھٹی ملی کوئی اور بھاگا ہیرا گاؤں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ہرنید کو پتہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ کسان مجھے اپنا مہمان بنا کر بڑے خوش ہوتے تھے ــــ یہاں رہ کر میں نے کسانوں کی اصلاح بھی تو کی۔ ایک مرتبہ لگان کے مسئلہ میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی تو ہم سب اسی طرح زمیندار جی کے گھر گئے تھے۔ جیسے کہ اس دن شمبھو دادا کسانوں کے ساتھ آئے تھے ــــ"

"پھر زمیندار جی نے سنی تھی تمہاری فریاد؟" وہ ہنس کر بولی۔

"ایسے کیسے نہ سنتا۔ اس کے باپ کو بھی نہ چھوڑتے ہم"۔

"تو کیا پورا لگان معاف کرا لیا تھا"؟

رمیش ہنسا۔ "روپے میں دو آنے بھی کچھ کم نہیں ہوتے"۔

دونوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ رمیش بولا۔ ہیرا گاؤں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے، ابھی

لئے ہیں ....

سروج نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "مگر میں پوچھتی ہوں تم اپنے دیہات پر نہیں دیکھ سکتے تھے زندگی کا اصلی روپ، یہاں کچھ نہیں سیکھ سکتے تھے تم! اپنے ہی آدمیوں میں مل جل کر تم بڑی اچھی طرح کا کر سکتے تھے!!"

"ہرگز نہیں، ڈیڈی کے ہوتے بھلا ایسا ممکن ہے۔ میں تو کھیتوں ہی کی طرف گھومنے کی غرض سے نکلتا تھا۔ تو ڈیڈی اتنے ناراض ہوتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو مجھے بھی گھوڑے کی طرح اصطبل میں باندھ رکھیں وہ زور سے ہنسا" مگر مجھے تو اس میں کوئی برائی نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ اب تو میں یہ چاہتا ہوں کہ زمینداری کا یہ ٹھاٹ باٹ چھوڑ کر سادہ سا کسان بن جاؤں"۔

"اور ڈیڈی کے نام کو بٹہ لگا دوں"۔ سروج نے ہنس کر اس کا جملہ پورا کر دیا۔ رمیش ہنس پڑا۔

"یہ تمہاری خام خیالی ہے"۔ ڈیڈی کے نام کو بٹہ کیسے لگ سکتا ہے بھلا۔ میں تو جس طریقہ سے کسانوں میں گھل مل جانا چاہتا ہوں اُس سے ہمارا نام اونچا ہو جائے گا۔ غریبوں کی ہمدردی۔ اور محبت حاصل کر لینا، اُن کے دل جیت لینا۔ یہ کیا کم بات ہے"۔

"یہ کہو نا، جس رکابی میں کھاتے ہو اُسی میں سوراخ کرنے پر تُل گئے ہو تم؟"

"نہیں سرو، یہ بات نہیں ہے"۔ وہ بڑی محبت سے بولا "ہم دونوں ایک ہی بات سوچتے ہیں مگر سوچنے کا طریقہ الگ الگ ہے، میں سمجھتا ہوں میرا طریقہ زیادہ صحیح ہے۔ میں رکابی میں سوراخ کرنے نہیں جا رہا۔ بلکہ ٹوٹی ہوئی رکابی کو جوڑنا چاہتا ہوں ..... سمجھیں؟"

سامنے ہی ہرے بھرے کھیت لہرا رہے تھے۔ لمبے لمبے، ہرے ہرے مکئی اور جوار کے بھٹے ہوا کے سے اِدھر اُدھر جھول رہے تھے۔ گیہوں کی لمبی لمبی بالیاں سرسرا رہی تھیں۔ بتھوے کے چھوٹے چھوٹے پودے ہوا میں جھوم رہے تھے۔ سروج چپ چاپ بھائی کی باتیں سن رہی تھی۔ رمیش کھیتوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"یہ اناج جب کھیتوں سے کاٹ لیا جائے گا۔ تو کسانوں کے دل بجائے خوشی کے غم سے بھر جائیں گے، لگان کے بہانے۔ مالگزاریوں کے بہانے۔ پوجا کے دان کے بہانے۔ طرح طرح کے حیلوں سے آدھا اناج

زمیندار کے گھر پہنچ جائے گا۔ اور جنہوں نے یہ اناج پیدا کیا ہے۔ وہی دانے دانے کے لیئے ترسیں گے۔ اور ان کے حصے میں کیا آئے گا ـــــ وہی سال میں چھ مہینے فاقے"

"یہ کہو! ڈیڈی کے دشمن ہو گئے ہو تم"

"بالکل پاگل لڑکی ہے اکدم" رمیش زور سے ہنسا۔ "میں اپنے باپ کا دشمن کس طرح ہو سکتا ہوں بھلا۔ میں تو سیدھی سادی بات کہتا ہوں۔ کہ بجائے راجے مہاراجوں کی طرح حکم چلانے کے، ہم خود کسانوں میں مل جل کر کام کریں۔ ان پر ظلم نہ کریں۔ ان کی زمینیں انہی کے پاس رہنے دیں۔ آج کسان الگ ہم سے یوں ڈرتے ہیں جیسے لوگ جنگلی جانوروں، شیر، چیتوں، ریچھوں، سے ڈرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس رعب داب اور ظلم کی حکومت کو توڑ کر مزے سے محبت سے یکسانیت سے کیوں نہ رہیں۔ نہ کوئی چھوٹا نہ کوئی بڑا۔ وہی جو ہمارا بلکہ ہر انسان کا پیدائشی حق ہے"

"مگر اس سے ہمیں کیا فائدہ ملے گا بھئی؟" سروج ایک بوڑھے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ جو اپنے کھیت کے منڈیر پر گیلی مٹی تھوپ رہا تھا۔

رمیش ہنسا "تمہاری نظر میں کوئی یہ کوئی فائدہ ہی نہیں۔ سب کسان چین امن سے اپنے اپنے کھیتوں میں بغیر کسی ڈر اور دباؤ کے بے فکری سے اناج اگائیں گے۔ نہ لگان کی زیادتیوں کا خطرہ نہ بے دخل ہو جانے کی فکر۔ ان غریبوں کی زندگی تو مجھے ہی معلوم ہے کچھ۔ اور وہ بھی اسلیئے کہ بھگوان نے قسمت سے مجھے موقع دیدیا تھا۔ ان لوگوں کی زندگی قریب سے دیکھنے کا۔ ڈیڈی فضول اتنا ظلم کرتے ہیں۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ بغیر ظلم کے بھی حکومت چل سکتی ہے"

سروج ناگواری سے بولی۔ "ڈیڈی بھی کیا کریں؟ تمہارے ہی لئے تو وہ سرمایہ کرتے ہیں۔ تم ہی ان کے اکلوتے لڑکے ہو ظاہر ہے یہ ساری جمع جتھا تمہارے ہی لئے ہے"

رمیش بھڑک اٹھا۔ "بہت خوب! یہ آج نئی بات معلوم ہوئی کہ یہ سب میرے لئے ہو رہا ہے۔ اگر آج میں ڈیڈی سے یہ بات کہہ دوں کہ مجھے روپیہ پیسہ کچھ نہیں چاہیئے۔ تو کیا ڈیڈی زمینداری کو لات مار دیں گے۔ ڈیڈی کی رگوں میں جاگیرداری خون دوڑ رہا ہے۔ اور ان کے دل و دماغ میں حکومت کرنے کی بڑی خواہش تھی اس خواہش سے وہ روگردانی نہیں کر سکتے"

"کیا تمہیں اس چیز سے انکار ہے کہ تمہاری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے؟" سروج تیکھے پن سے بولی۔

رمیش سنجیدگی سے بولا۔ "میں اس بات کو بڑی سنجیدگی سے مانتا ہوں۔ مگر یہ بھی تو ہے کبھی کبھار ماحول انسان کو بدل کے رکھ دیتا ہے۔ میں نے کسانوں کی زندگی دیکھی۔ ان کے ماحول میں کچھ دن رہا۔ بس میرے دماغ نے وہی اثر قبول کر لیا۔ اور مجھے حیرت ہے کہ مجھ میں یہ تبدیلی اتنی جلدی کیسے آئی۔ مگر حیرت سے زیادہ مجھے خوشی ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کبھی نہ کبھی کچھ کر ہی لوں گا اور اب تو روز بروز میں اپنے ارادوں کو مضبوط پاتا ہوں کہ میری جان چلی جائے۔ تو بھی کوئی پرواہ نہیں۔"

سروج کچھ نہ بولی۔ گھوڑے اب اسی کھیت کے پاس سے گذر رہے تھے، جس کی منڈیر پر ایک بوڑھا آدمی مٹی تھوپ رہا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں قریب آئیں تو اس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا، مگر بے تعلقی سے پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ رمیش حیرت سے بولا۔

"ارے یہ تو شمبھو دادا ہے۔" شمبھو اپنے کھیت کی منڈیر پر مٹی اور اینٹیں رکھ کر اسے اونچا کر رہا تھا۔

رمیش نے گھوڑا روک لیا۔ "کیا کر رہے ہو دادا۔"

بوڑھا شمبھو حیران رہ گیا۔ وہ ایک نظر رمیش کو دیکھتا پھر اکدم سروج کو دیکھنے لگ جاتا۔ ان کی گوری گوری رنگتیں، انگریزی وضع قطع کے کپڑے۔ اور اونچے اونچے گھوڑے دیکھ کر وہ سٹپٹا گیا اور بوکھلاہٹ میں رمیش کے سوال کا جواب بھی نہ دے سکا۔

سروج انگریزی میں بولی۔ "معلوم ہوتا ہے انہوں نے ہمیں پہچانا نہیں۔"

بات ٹھیک تھی۔ رمیش اور سروج شہر میں کالج میں پڑھتے تھے۔ ماہ دو ماہ کے لیے گاؤں آتے تو بنگلہ پر ہی رہتے۔ یہ تو پہلا اتفاق تھا کہ دونوں کھیتوں کی طرف نکل آئے تھے۔ ورنہ ہمیشہ پچھم کی طرف بہنے والی ندی کی طرف ہی سیر کو جاتے۔ شمبھو نے رمیش کو کئی بار کھیتوں میں گھومتا دیکھا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ زمیندار جی کا بیٹا ہے۔

رمیش متانت سے بولا: "دادا ہمیں پہچانتے نہیں۔ ہم زمیندار جی کے بچے ہیں؟"

بوڑھے شمبھو کے ہاتھ سے اینٹ چھوٹ گئی۔ بوکھلا کر بولا۔

سجور! میرے گھر میں اناج نہیں ہے۔ کھالی تھوڑی سی جواری پڑی ہے۔" اُس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری۔ مٹی سے لتھڑے ہوئے اُس کے ساتھ تھر تھر کانپ رہے تھے۔

رمیش انگریزی میں سروج سے بولا۔ "دیکھتی ہو سروج! ڈیڈی کا نام سنتے ہی غریب کیسے کانپ اُٹھا میں حکومت چلا کرتی ہے: چھٹا بک جائے تو بغیر دوا دارو کے ہی پھوٹ پڑتا ہے۔ ایسا ظلم اور سروج چل سکتا ہے؟"

سروج منہ سے کچھ نہ بولی مگر اُس کے چہرے پر جو ندامت چھا گئی تھی۔ وہ رمیش سے چھپی نہ رہ سکی۔ رمیش ہنس کر بوڑھے سے مخاطب ہوا۔ "نہیں دادا! ہم تمہیں کوئی حکم دینے یا تمہارا اناج چھیننے نہیں آئے ملیا۔ ہم تو تمہارے کھیت اور گھر دیکھنے آئے ہیں۔"

شمبھو کو اتنے بڑے اعزاز کی خواب میں بھی نہ سوجھ سکتی تھی کہ زمیندار جی یا اُن کے بچے اُس کا گھر دیکھنے آسکتے ہیں۔ وہ پھول اٹھا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اُس کے دل کو شک نے آگھیرا۔ کہیں اس میں بھی زمیندار جی کی کوئی مصلحت نہ ہو۔

رمیش چہرے سے اُس کے جذبات بھانپ گیا۔ بولا۔

"تمہارا گھر کہاں ہے دادا؟"

بوڑھے نے سامنے ہاتھ ہلا دیا۔

"ہمیں اپنا گھر بتاؤ گے دادا؟" سروج میٹھی آواز سے بولی۔ اُس کے لہجہ میں شمبھو کے لئے ہمدردی رہی تھی۔ رمیش مسکرا کر رہ گیا۔

"آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں حجوم، آئیے سامنے ہی میرا جھونپڑا ہے:" اور وہ آگے آگے چلنے لگا۔ رمیش اور سروج اپنے اپنے گھوڑوں سے اُتر پڑے، اور باگیں تھام کر شمبھو دادا کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ چلتے چلتے رمیش یوں ہی پوچھ بیٹھا۔

"شمبھو دادا! تمہاری بچیا تو اب بڑی ہو گئی ہو گی؟"

شمبھو نے پلٹ کر دیکھا اس کی آنکھوں سے بے بسی ٹپک رہی تھی۔ وہ ایک منٹ چپ رہ کر بول اُٹھا "آٹھ چار دن میں کپاڑی ہو گی حجور۔ مگر موٹی کھوب ہو گئی ہو گی۔ اپنے گھر رہتی تو آدھا

دودھ بیچ ڈالتے۔ کچھ کھالیتے۔ اب تو سارا دودھ وہ خود ہی پی لیتی ہوگی ہجور۔ انسان اور جنور کی بات نہیں ہے ہجور۔ بے پھکری سے کھانے کو ملے تو ردُٹی کھوب آنگ لگتی ہے۔" اور وہ بناوُٹی ہنسی ہنس پڑا۔

رمیش بے تابی سے بول اٹھا "تو کیا ہماری بھینس تمہارے پاس نہیں ہے۔"

"نہیں ہجور — جمیندار جی کے گھر ہے۔"

رمیش نے سروج کو دیکھا اور سروج نے رمیش کو — رمیش کے قدم سُست پڑ گئے۔ سروج تو اس خبر کو سُن کر بھونچکی ہی رہ گئی۔ بہت دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔ "مگر ڈیڈی نے تو مجھ سے وعدہ کر لیا تھا۔"

رمیش کچھ نہ بولا۔ اُس نے سروج کے مُنہ کو دیکھا۔ اُسے ایسا لگا کہ اتنے دنوں سے وہ جو بات لاکھ کوششوں کے بعد بھی اُس کے دماغ میں نہ بٹھا سکا تھا۔ وہ آپ ہی آپ اُس کے ذہن میں بیٹھ گئی ہے اُس کے چہرے پر عجیب قسم کی اُداسی بکھر گئی تھی۔ رمیش طنز بھری ہنسی ہنس پڑا۔

سروج نے بھائی کی اور دیکھا۔ مگر اُس کی ہنسی میں شامل نہ ہو سکی۔ بلکہ وہ سوچ رہی تھی رمیش کو اس بات میں ہنسی کا کیا پہلو نظر آگیا تھا۔

رمیش کو شنکر داوا کا گھر دیکھ کر کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی کیونکہ وہ اس قسم کے گھر نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ ان میں رہ بھی چکا تھا۔ اُن میں کھا بھی چکا تھا۔ سو بھی چکا تھا۔ مگر سروج ہر چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

سوہنیا حیرت کی تصویر بنی سروج اور رمیش کو دیکھ رہی تھی۔ سروج نے اس وقت سر سے رومال کھول کر گلے میں باندھ لیا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کے رومال کے اوپر اس کا چہرہ بہت گورا اور جاذبِ نظر لگ رہا تھا۔ سوہنیا کی نگاہ سروج سے ہٹ کر رمیش پر جم گئی اور اُس کے دھُول سے اَٹے بال۔ چھریرا بدن اور سفید لباس۔ یہ چیزیں سوہنیا کو بھلی لگی ہوں۔ یا نہ لگی ہوں مگر اُس کا دِل جیسے رمیش کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

جب شمبھو نے الگ لے جاکر گوری کو دھیرے دھیرے بتایا کہ یہ زمیندار جی کے بیٹا بیٹی ہیں تو گوری جھینپ اٹھی۔

"میں ان سے اپنی بھینسا مانگوں گی — میری سوئی۔"

مگر شمبھو نے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "پاگل نہ بن گوری، کیا مجھے جیل کھانا بھجوائے گی؟ جل پان تو کرایا نہیں اُلٹا جھگڑا کھڑا کرنے لگی۔"

"میری جوتی کرائے جل پان جس ......" شمبھو باہر نکل گیا۔ گوری پر اُس کا بس نہ چلتا تھا، جب سے بچھیا اور موتی زمیندار جی کے گھر بندھ گئی تھیں، اُس نے سوہنیا کو پکارا مگر جیسے اُس نے سُنا ہی نہیں وہ ٹکٹکی باندھے رمیش کو دیکھے جا رہی تھی۔

شمبھو سامنے آکر بولا۔ "ارے سوہنیا، یہ جمیندار جی کے بیٹے ہیں، یہ بیٹی ہیں، کچھ جل پان کرائے گی یا کھڑی ہے منہ تاکتے۔"

"ہائے بھگوان، جمیندار جی کے بیٹے! وہ گھبراہٹ سے چلّائی اور اکدم اندر بھاگ گئی۔

رمیش کا دل سوہنیا کی اِس حرکت سے جیسے بیٹھ گیا...... یہ لوگ جمیندار کے نام سے کتنا ڈرتے ہیں!

اُس نے یوں ہی لُوٹا لینے کیلئے مُچھمی کو پاس بلایا۔ "زمیندار جی کے گھر چلو گی؟"

اُس نے بڑی بیباکی سے سر ہلا دیا۔ "اونہوں"۔

"کیوں بھلا؟" سروج نے پوچھا۔

"بالو کہتا ہے جمیندار کسائی ہے۔ ہماری گائے بچھیا چھین لے گیا"۔

سروج کٹ کے رہ گئی۔ رمیش نے سروج کو دیکھا جو سر جھکا کے بیٹھ گئی تھی۔ (تمہارے ڈیڈی کتنے انصاف پسند ہیں کہ لوگ انھیں قصائی کہتے ہیں!)

شمبھو ہاتھ جوڑتا آیا۔ "ہجور! ہم گریب آدمی ہیں آپ کی کیا سیوا کر سکتے ہیں؟ ہجور ہمارا دل رکھنے کو کچھ نہیں تو کھالی دو گراسے[1] اٹھالیں"۔

موٹی موٹی دو روٹیاں اور تر دلّے کا ساگ تھا۔ رمیش نے خود ہاتھ دھو کر سروج کے بھی ہاتھ دُھلائے اور بڑے مزے سے کھانا شروع کر دیا۔ مگر سروج پہلا نوالہ ہی نہ نگل سکی۔ وہ حیرت سے رمیش کو دیکھ رہی تھی کہ کیسا ہے مربھکوں کی طرح ایسے بدمزہ کھانے پر ٹوٹ پڑا ہے۔

"سوہنیا بھانپ گئی۔ دردناک مسکراہٹ سے بولی۔ "مالکن ہم بہت گریب ہیں"۔ سروج بوکھلا کر بولی۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ کھا تو رہی ہوں"۔

---

[1] نوالے

اور وہ سنبھل کر نوالے اٹھائے گی۔

رمیش اور سروج واپس چلے تو شمبھو اور سوہنیا دور تک چھوڑنے آئے۔ سروج رمیش سے

بس بولی۔ "تم نے ایک بات محسوس کی؟ سب نے ہم سے بات کی مگر سوہنیا کی مالا ملی تک بھی نہیں ہم سے۔

حالانکہ میں نے سوہنیا سے پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ اندر بیٹھی ہے۔

"مجھے کوئی تعجب نہیں ہے اس بات پر۔" رمیش متانت سے بولا۔

"وہ کیوں؟" سروج حیرت سے بولی۔

"شمبھو دادا کی بیوی کو معلوم ہے کہ بھیا زمیندار نے چھین لئے ہے۔ اور ہم کوئی دوسرے نہیں۔ اسی زمیندار

کی اولاد ہیں نا۔ بھلا ہمارا مونہہ دیکھنا کیوں پسند کرے گی ۔۔۔؟" پھر شمبھو سے بولا۔

"اچھے دادا بہت دور آ گئے اب چلے جاؤ۔"

سوہنیا نے خاموش آنکھوں سے رمیش کو دیکھا۔ رمیش گھبرا سا گیا۔

"بہت دور آ گئے سوہنیا اب چلے جاؤ تم لوگ۔" اس نے بوکھلاہٹ میں وہی جملہ پھر دہرایا۔

"آپ لوگ گھوڑے پر بیٹھ جلئے۔ ہم ابھی چلے جائیں گے۔ ادھر جانا بھی کہاں ہے۔ ہمیں کھیت میں کچھ

کام کرنا ہے۔"

دونوں اچک کر گھوڑوں پر بیٹھ گئے۔ سوہنیا باپ سے بولی۔

"باپو! مجھے تو چھوٹے سرکار کچھ برے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔"

شمبھو ابھی تک رمیش اور سروج ہی کو دیکھ رہا تھا ۔۔۔ جیسے چونک کر بولا۔

"ہاں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ بڑے آدمیوں میں بھی سبھی تو خراب نہیں ہوتے۔"

رمیش نے پلٹ کر دیکھا، باپ بیٹی دھیرے دھیرے واپس ہو رہے تھے۔ "کتنے غریب لوگ ہیں بچارے

سوہنیا کی ساڑھی کتنی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔"

سروج اپنی ہی فکر میں غلطاں پیچاں تھی۔ تھوڑی دیر بعد چونک کر بولی: "تم مجھ سے کچھ کہہ رہے

تھے رمیش؟"

"تم کس خیال میں کھوئی ہو؟" رمیش ہنس کر بولا۔ "کھانا بہت بدمزہ لگا کیا؟ میں تو کئی بار کھا چکا

ہوں ایسا کھانا۔ ایسا کچھ بُرا بھی نہیں ہوتا ــــ اصل میں تم نے کبھی کھایا ہی نہیں۔ خیر رفتہ رفتہ جس چیز کی عادت ....

" رمیش! " سروج اس کی بات کاٹ کر ناگواری سے بولی: " میں کھانے کے بارے میں نہیں سوچ رہی کچھ بھی مجھے سارا غصہ ڈیڈی پر آ رہا ہے۔ مجھ سے وعدہ کر کے بچھیا کیوں نہیں دی انہوں نے شمبھو دادا کو۔

" اتنی سی بات پر اتنا غصہ اور اتنی فکر! " اور وہ معنی خیز نگاہوں سے سروج کو دیکھنے لگا۔

" اتنی سی بات ہے یہ۔ " سروج چلّائی " زمیندار کا نام سن کر ڈر جانا، زمیندار کی اولاد کو دیکھ کر گھر میں چھپ جانا، مارے نفرت کے ہم سے آنکھیں تک نہ ملانا۔ یہ سب اتنی سی بات ہے شمبھو دادا کی بیوی ہم سے ملی تک نہیں اور تم اسے اتنی سی بات کہتے ہو؟ اگر وہ ڈیڈی کا نام سن کر خوش ہو جاتے، ڈیڈی کے بچوں سے ملنے دیوانہ وار آگے بڑھتے۔ تو یہ ڈیڈی کی کتنی بڑی فتح تھی کہ وہ اپنی پرجا میں اتنے چاہے جاتے ہیں کہ لوگ ان سے، ان کے بچوں سے ملنے کو بیتاب ہو کر بھاگتے آتے ہیں۔ مجھے آج پتہ چلا ہے کہ ہم میں اور ان میں بہت بڑا فاصلہ ہے۔ بہت بڑی خلیج ہے، ہمیں اس خلیج کو عبور کرنا ہی ہوگا۔ ان فاصلوں کو طے کرنا ہی ہوگا۔ سوال ایک گائے اور ایک بچھیا کا نہیں ہے بلکہ ــــ "

سروج کا منھ تمتما رہا تھا اور وہ ہکساں کیے جا رہی تھی۔ رمیش گھوڑے پر بیٹھا ہوئے ہوئے مسکرا رہا تھا ــــ۔

وہ گہرے سرخ رنگ کے پھولوں کی ہلکی پھلکی ریشمی ساڑی پہنے۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بڑے کمرہ میں داخل ہوئی۔ اور جا کر ایک کرسی کھینچ کر ڈیڈی کے مقابل بیٹھ گئی۔ رمیش اور ممی اس کے داہنے بازو بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانا بالکل خاموشی سے کھایا جا رہا تھا۔ ایکدم سے زمیندار صاحب بولے :-

" ارے سروج! کیا بات ہے آج تم اور رمیش بالکل نہیں لڑ رہے ہو! "

ان کی بیگم نے تائید کی۔ " ہاں دونوں گم سم سے ہیں۔ "

" اب ہم لڑنے کیلئے بچے نہیں رہے ڈیڈی۔ " وہ ہاتھ روک کر بڑی سنجیدگی سے بولی۔

" ہو۔ ہو۔ ہو ــــ " ڈیڈی بڑا بھاری قہقہہ لگا کر بولے۔ " یہ احساس کب سے پیدا ہو گیا ہماری بیٹی میں؟ "

"آج ہی پیدا ہوا ہے۔" وہ غصہ کے مارے اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ "ڈیڈی! آپ نے وعدہ کرنے کے باوجود بھی شمبھو دادا کی بھیا انھیں واپس نہیں کی ____ یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا!"

زمیندار صاحب بھی سنجیدہ ہو گئے۔ "تمھیں کیونکر معلوم ہوا؟"

"مجھے کیسے بھی پتہ چل گیا۔ مگر آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا نا؟"

"وہ تمہاری حماقت تھی اور زمینداری حماقتوں کے سہارے نہیں چلا کرتی۔"

"اگر میری حماقت تھی تو آپ کا فرض تھا کہ مجھے آگاہ کر دیتے۔ وعدہ کیوں کیا تھا آپ نے؟"

"ڈیڈی! پوجا میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟" دفعتاً رمیش نے پوچھا۔

ڈیڈی اپنی بیٹی کے بدلے ہوئے رویئے سے جزبز ہو رہے تھے۔ کچھ نہ بولے۔ ممّی نے جواب دیا۔ "ان ہی دو ایک ہفتوں میں ہونے والی ہے۔"

"بہت خرچہ آتا ہے کیا پوجا پر؟"

"ہاں بیٹا! ہزاروں روپیہ اُٹھ جاتا ہے۔ بڑی مصیبت کے بعد جمع ہوتا ہے یہ روپیہ!"

وہ حد درجہ ٹیڑھے پن سے بولا۔ "آپ لوگوں کو کاہے کی مصیبت۔ پیسہ تو کسانوں اور گاؤں والوں سے ہی وصول کیا جاتا ہے نا؟"

(بچے آج کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہے ہیں)

ممّی مسکرائیں۔ "وصول کرنا بھی تو ایک مصیبت ہے۔ کم بخت ہزار بہانے تو بناتے ہیں۔"

"مگر بیچاروں کے بہانوں سے بھی تو کام نہیں چلتا۔ ان کے جانور وصول کر لئے جاتے ہیں۔ کیوں ممّی؟"

زمیندار صاحب چپ نہ رہ سکے انھوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو اس روپ میں آج ہی دیکھا تھا۔ وہ دونوں کو بیحد کھلنڈرے اور بات بات پہ جھگڑ بیٹھنے اور دوسرے ہی لمحے صلح کر لینے والے بچے سمجھتے تھے۔ بولے "معلوم ہوتا ہے دونوں بھائی بہن سازش کر کے بیٹھے ہیں آج۔"

سروج جواب تک چپ بیٹھی تھی، بول اٹھی "سازش نہیں ہے، سیدھی سادی سی بات ہے شمبھو دادا کی بھیا انھیں دیدیجئے۔ ایسا ہی ہے تو شمبھو دادا کی طرف سے میں اپنی پاکٹ منی سے پوجا کا مال دیدوں گی۔"

ڈیڈی کڑوے لہجے میں بولے۔ "اور تمھیں پاکٹ منی کون دیتا ہے؟" سروج ہونٹ کاٹنے لگی۔

رمیش کہہ رہا تھا "اور ممی میں نے سُنا ہے کہ گو کسانوں اور گاؤں والوں سے پیسہ وصول کرکے کا اہتمام کیا جاتا ہے مگر وہ خود مندر کے باہر ہی کھڑے رہ کر پرشاد لیتے ہیں، اندر قدم بھی نہیں دھر سکتے پوجا کرنے کا حق صرف پنڈتوں اور برہمنوں کو حاصل ہے۔ شاید بھگوان کا یہی کہنا ہے کہ امیر تو مندر کے اندر بیٹھ کر پوجا کریں اور غریب مندر میں داخل بھی نہ ہو سکیں۔"

"رمیش ــــ!" زمیندار جی گرجے۔ "تم فضول بک بک کر رہے ہو۔"

"یہ بک بک نہیں ہے ڈیڈی!" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "اگر آپ میری بات ذرا ٹھنڈے دل ....

مگر انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "شہروں کی ہوا کھا کر تم پر پُرزے نکال رہے ہو۔ مگر مجھے اتنا بے وقوف نہ سمجھو کہ تمہاری باتوں میں آ جاؤں گا۔ بڑے چھوٹے کا فرق بھگوان نے لگایا ہے۔ ہمارا اپنا بنایا ہوا نہیں ہے۔"

"مجھے اتنا بتلائیے کون شاستر کہتا ہے کہ غریبوں سے دبا ڈال کر، ظلم ڈھا ڈھا کر پوجا کا کام لو۔ اور اُنہیں پوجا کرتے سمے مندر سے باہر ڈھکیل دو۔"

"تو یوں کہیے صاحبزادے کمیونسٹ ہو گئے ہیں۔"

رمیش بیباکی سے ہنسا۔ "میں جانتا تھا آپ یہی کہیں گے۔"

"اور میں بھی جانتا تھا کہ آج نہیں تو کل کبھی نہ کبھی تم یہ ذکر ضرور چھیڑو گے۔ کسانوں سے تمہاری یہ ہمدردی۔ نیچ لوگوں سے تمہاری میٹھی میٹھی باتیں۔ رات دن غریب کسانوں کے گھروں اور کھیتوں کے پھیرے میں جانتا ہوں تم پر کون سا بھوت سوار ہے۔ مگر کان کھول کے سُن لو۔ میں نے جائداد اس لئے نہیں پیدا کی ہے کہ یوں غریبوں پر لُٹا دوں۔ میں نے پڑھ لکھ کر قانون سیکھ کر اپنی جائداد دشمنوں کے ہاتھوں سے اس لئے نہیں کھینچی کہ کسانوں کو اس کا مالک بنا دوں۔ آج میں مقدمے لڑ لڑ کر اپنی جائداد حاصل نہ کرتا تو میں بھی دیکھتا کہ کس برتے پر چھوٹے سرکار کہلاتے۔ یہ میری جوتیوں کا ہی طفیل ہے صاحبزادے۔ محنت کا گاڑھا پسینہ بہا کر کماؤ گے۔ تب جانو گے پیسہ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ خالی خولی دُم مار کے غریبوں کا ہمدرد بن جانا سبھی کو آتا ہے۔"

وہ متانت سے بولا۔ "ڈیڈی یہ آپ کی غلط فہمی ہے، مجھے پیسے سے کوئی لگاؤ نہیں اور نہ چھوٹے

سرکار" کا لیبل مجھے اپنے ماتھے پر جلتا انگارہ سا محسوس ہوتا ہے"۔

"میری غلط فہمی ہے! کیا خوب۔ اگر آج دانہ پانی بند کر دوں تو چیں بول اٹھو گے۔ پھر نہ کہہ سکو گے۔ مجھے پیسے سے کوئی لگاؤ نہیں؟"

"میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ دوبارہ پھر کہتا ہوں کہ مجھے پیسے کوئی لگاؤ نہیں۔ دنیا میں سارا جھگڑا پیسے کا ہے۔ ایسی چیز سے پیار کرنا میرے لئے عذاب سے کم نہیں۔ ویسے آپ جو چاہیں سمجھتے رہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو سن لو کہ میں اپنی جائداد سے تمہیں ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔"

رمیش نے اپنے مضبوط بازو ہوا میں پھیلا دیئے۔ "یہ بازو سلامت رہیں، پیسہ کیا چیز ہے، آتا جاتا رہتا ہے۔"

"بھیا! سروج دھیرے سے بولی۔ "پاگل نہ بنو۔"

"اب منانے سے کچھ نہیں بنے گا۔ میں اس کم بخت کو اپنی جائداد سے پھوٹی کوڑی بھی نہ دوں گا۔"

"سروج! ڈیڈی کو غلط فہمی میں مت مبتلا کرو۔ میں پاگل پن نہیں کر رہا ہوں۔ میں اپنے حواس میں ہوں۔" پھر وہ زمیندار صاحب سے مخاطب ہوا: "ڈیڈی غصہ میں آپ چاہے کچھ بھی کہہ لیجئے۔ مگر مجھے امید ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی سنبھل ہی جائیں گے۔ چھوٹائی بڑائی کوئی چیز نہیں۔ آپ خود دیکھ لیں گے۔"

مگر ڈیڈی برس پڑے۔ "ہاں ہاں مجھے ہی تعلیم دینے چلے ہو ــــ ڈیڈی کبھی نہ کبھی سنبھل ہی جائیں گے ــــ نیچ لوگوں کو مندر میں گھسالو صاحب زادے بڑے خوش ــــ نامعقول کو پڑھا لکھا کر اسی لئے ہمالائق کیا کہ آج اپنے باپ پر انگلی اٹھائیں۔ بڑے تیس مار خاں بنے پھرتے ہیں اور یہ بالشت بھر کی چھوکری بھی اس لونڈے کی ہاں میں ہاں ملانے چلی ہے۔ دیکھوں گا دونوں بہن بھائی مل کر کون سی مساوات قائم کرنے چلے ہیں۔ ساری اکڑ میرے پیسے پر ہے۔ لوگ اسی لئے اولاد کی خواہش کرتے ہیں کہ بڑھاپے میں لاٹھی کا کام دینے کی بجائے۔ الٹا وبال جان بن جائیں ــــ"؟

اور زمیندار جی بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

رمیش دن دن بھر کسانوں کی طرف رہتا۔ جہاں بھتو
بلو جائیں بہت تھوڑے دن باقی رہ گئے تھے۔

چمار، گنگو کمہار۔ اور دوسرے نیچ نیچ وَ یٹر دِل، بنجاروں، کی کانفرنس ہوتی رہتی۔ رمیش ان سب کو ہمت بندھاتا تھا "تم نے پوجا کا مان دیا ہے تو کیوں نہ مندر کے اندر جا کر پوجا کرو۔" مگر لوگ ڈرتے تھے۔ شمبھو دادا اپنی سفید سفید مونچھیں ہلا کر ہاتھ جوڑ لیے "چھوٹے سرکار گریبوں کو اور برباد نہ کرو۔ ہمارا حکہ پانی بھی بند ہو جائیگا اور بھوکوں ہی مر جائیگا پورا خاندان۔" مگر رمیش اُن کی عاجزی کو نظر انداز کر دیتا۔ وہ سب کسانوں میں نیچ لوگوں میں گھوما۔ اُسے پتہ چلا تھا کہ شالا کے سال بڑے زور ول پر پوجا ہوتی ہے۔ ہر قسم کی سختی کے ساتھ پوجا کا مان حاصل کیا جاتا ہے۔ مگر پوجا کے دن انہیں مندر میں پھٹکنے بھی نہیں دیا جاتا۔

"اب کے سال ہم سب ساتھ ساتھ پوجا چڑھائیں گے۔ کیوں رامو کاکا؟" رمیش ہنس کر بولا۔

"ارے کا بات کرتے ہو چھوٹے سرکار۔ آپ اونچی ذات کے آدمی ہم نیچ اوپر سے گریب۔ ہمارا کون ٹھکانا؟" رمیش بول اُٹھا "ایسا نہ کہو کاکا، ہم اونچ نہ تم نیچ، سب بھگوان کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ کیوں شمبھو دادا؟"

شمبھو دادا اس ناقابلِ یقین کو سُنکر ہنس پڑے۔ شیوجی کے مندر میں اس کے قدم پڑیں!! یہ بات ہی مضحکہ خیز تھی۔

سوہنیا ہنس کر بولی: پارسال ہم پوجا کے بھیت مندر گئے تھے تو پُجاری جی نے ایسا بول کے ڈھکیل دیے تھے کہ تم نیچ ہو۔ گلیچ لوگ ہو۔ کرشن بھگوان گلیچ لوگوں کی پوجا کبول نہیں کرتے۔" اس کی ہنسی میں درد بھرا ہوا تھا۔

رمیش تڑپ اُٹھا: اگر تم پوجا کا مان دیتے ہو تو کوئی بات نہیں کہ پوجا نہ کر سکو ــــ دیکھو پرسوں ہی تمہیں مندر میں لے چلتے ہیں ہم۔ اور کبھی اگر مان نہ دو تب بھی مندر تو بھگوان کا ہوتا ہے۔ کسی انسان کا حق تو نہیں ہوتا اس پر۔ اس میں امیر غریب سبھی جا سکتے ہیں۔ کسی ایک کی جاگیر تو نہیں ہے وہ"

آج شیام نگر میں سب سے بڑے مندر میں بڑی دھوم دھام تھی۔ گاؤں بھر میں منڈوے اور مشعل جل رہے تھے۔ زمیندار جی کے زیرِ اہتمام یہ سارے کام ہوتے تھے۔ آج وہ بڑے خائف خائف سے نظر آ رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ رمیش تمام نیچ لوگوں کو سمیٹ کر آج کرنے آنے والا ہے

اور یہی موقع گاؤں کی تاریخ میں ایسا ہوتا ہے۔ جب سر پھٹول ہو جاتی ہے۔ لاٹھیاں چلی جاتی ہیں اور جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اور رمیش پھر بھی ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور انہیں معلوم تھا کہ ان کا اکلوتا بیٹا کتنا ضدی اور ہٹیلا تھا۔ ایک طرف ضد اور دھرم کا سوال تھا۔ دوسری طرف پدری محبت۔

مندر کے سنکھ اور گھنٹیاں بج اٹھیں۔ پجاری، پنڈت، برہمن مندر میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک طرف بڑے لوگ، اونچی ذات کے لوگ صاف ستھری دھوتیاں پہنے ماتھے پر ٹیکے لگائے براجمان تھے۔ دوسری طرف عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بھجن گائے جا رہے تھے۔ فضا میں پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ سب ساکت و صامت بیٹھے ہوئے تھے۔ سب کے دلوں میں بھگوان کی لو لگی ہوئی تھی۔ اسی دم باہر کچھ شور ہوا۔ پھر شور بڑھا اور کسی نے اونچی آواز سے کہا۔

"گاؤں کے نیچ لوگ آئے ہیں۔ مندر میں داخل ہونا چاہتے ہیں"

اونچی ذات کے لوگوں میں سنسنی دوڑ گئی۔ "مارو، ہٹاؤ۔ پیچھے۔ بھگوان کا گھر ہے مذاق نہیں ہے۔ کیا اپنے غلیظ قدموں سے بھرشٹ کرنا ہے مندر کو؟"——

سامنے ہی رمیش کھڑا تھا۔ "بھگوان کسی ایک کا نہیں ہے، سب کا ہے بھگوان نے کوئی فرق نہیں لگایا۔ انہیں اندر کیوں نہیں آنے دیا جاتا؟—— پھر——"

چھوٹے سرکار کے آگے کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ "آپ لوگ اندر کیوں نہیں داخل ہو جاتے؟" رمیش پکارا۔ کوئی بھی آگے نہ بڑھا۔ سب کے دل خوف سے ڈانوا ڈول ہو رہے تھے۔ پیروں میں زنجیریں سی پڑ گئی تھیں۔

"کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ آپ لوگ آگے کیوں نہیں بڑھتے—— راموکا کا—— شمبھو دادا—— سوہنیا—— کاکی—— کیا آپ لوگ پوجا نہیں کرنا چاہتے؟"

سوہنیا کے پیروں کو جنبش ہوئی، اس کے بدن سے سفید ساڑی لپٹی ہوئی تھی۔ سر کے بالوں میں تیل پڑا ہوا تھا۔ آنکھوں میں کاجل تھا اور ہتھیلیوں میں پوجا کی تھالی وہ آج بڑے اہتمام اور سنگار کے ساتھ پوجا کرنے آئی تھی—— اس نے ایک قدم اٹھایا—— دوسرا، تیسرا،—— اور پھر اس کا

پھر مندر کی چوکھٹ پر پڑا۔ مگر اسی سمے کسی نے دھکیل دیا۔ "نیچ چمارن ــــ گھستی چلی آرہی ہے مندر میں پوجا کی تھالی چھن سے زمین پر آپڑی۔

رمیش چیخا ــــ "یہ سوہنیا کو کس نے دھکیلا؟" پھر مڑ کر چلایا۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ آپکے آپ لوگ ــــ قدم اٹھائیے۔ آج پوجا کی خاطر جان کی بازی لگا دینی پڑے تو بھی پرواہ نہ کیجئے۔"

اور گویا کسی نے ان کے دلوں میں غیبی طاقت بھر دی ہو۔ سب کے قدم اٹھنے لگے۔ مندر میں کوئی گھبرا کر چیخا۔ "ارے سارے مندر گندہ ہوا جا رہا ہے۔ دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔ ارے کوئی اپائے کرو۔"

زمیندار جی سامنے ہی کھڑے ہوئے تھے ــــ نیچ لوگ مندر میں گھسے چلے آرہے تھے۔ یہ ان کی کتنی بڑی شکست تھی کہ ان کے کرم پر جینے والے، ان کے قدموں پر سر جھکانے والے آج ان سے ہار ماننے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ اور جان کی بازی لگا کر پوجا کرنے پر تُل گئے تھے۔ انہوں نے گرجدار آواز سے کہا۔ "سر توڑ دو آنے والوں کا۔ مار بھگاؤ کمبختوں کو۔ لاٹھیاں برسا دو ان کے سروں پر۔ ساری ذمہ داری میرے کاندھوں پر ہے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

سامنے ہی رمیش کھڑا تھا ــــ باپ بیٹے کی نظریں ملیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے رمیش نگاہیں چرا کر پھر کہہ رہا تھا۔ "ڈرنے کا مقام نہیں ہے۔ مندر میں داخل ہو جاؤ ــــ آج بھر صورت پوجا کرنی ہے پوجا کے سمان میں آج اپنا خون بھی شامل کر دو۔"

زمیندار جی کی اجازت پا کر گویا پجاریوں، برہمنوں، اور پنڈتوں کو منہ مانگی مراد مل گئی۔ جسکے ہاتھ میں جو آیا اسی سے نیچ لوگوں کی تواضع ہونے لگی۔ پجاریوں کے بھوجن پکنے کے لئے جو ایندھن آیا رکھا تھا اسی سے وہ نیچ لوگوں کے سر توڑنے کا مبارک فرض انجام دینے لگے۔ لاٹھیاں ــــ ڈنڈے ــــ پتھر سروں پر ــــ ہاتھوں پر ــــ بازوؤں پر، اور پیروں پر پڑ رہی تھیں۔ کہ ایک بھرپور لاٹھی رمیش کے سر پر پڑی۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا کہ ایک پتھر زور سے کنپٹی پر آلگا۔ ایک بھرپور۔ ایک بھرپور ہاتھ پیٹھ پر پڑا اور رمیش تیورا کر گر پڑا۔ لوگ زخمی ہو ہو کر گر رہے تھے۔ کوئی اپنے پورے وزن کے ساتھ رمیش کے سر پر آن پڑا۔ تھوڑی دیر کے لئے رمیش کو ایسا محسوس ہوا گویا۔ اس کا سر پچک کر رہ گیا ہو۔ وہ درد سے کراہا۔ اس کے سر سے خون کا فوارہ اُبل پڑا تھا۔ کنپٹی کے پاس خون جھر جھر

بہہ رہا تھا۔ "ارے یہ تو چھوٹے سرکار ہیں؟" کوئی چلّایا۔

لوگوں میں بدحواسی پھیل گئی تھی۔ رمیش اپنے حواس کھو رہا تھا۔ لاٹھی بہت زور سے پڑی تھی۔ اس کا سر چٹخ گیا تھا۔ ایکدم سے سوہنیا لپکی۔ بے خبری میں وہ مندر کی چوکھٹ کو پھلانگ گئی۔ رمیش مندر کے احاطہ میں گر پڑا تھا۔ اُس نے رمیش کا سر اپنی گود میں لے لیا دھول سے اَٹے ہوئے وہ بال جنھیں وہ بہت محویت سے دیکھتی رہی تھی۔ اب خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ معصوم اور خوبصورت چہرے پر خون جم رہا تھا۔ "چھوٹے سرکار" وہ دل کا سارا درد ضبط کر کے پکاری۔

رمیش نے آنکھیں کھولیں۔ بڑی مشکل سے مسکرا کر بولا "تم مندر میں داخل ہو ہی گئیں سوہنیا"

اُسی سمے زمیندار جی لپکے ہوئے آئے۔ رمیش کو خون میں نہایا دیکھ کر اُن کی محبت پگھل گئی۔ محبت کی اس پکار کے آگے دھرم کی وہ لگن جس کے لئے یہ چاند سا مکھڑا خون میں نہا گیا تھا۔ اب دل کے کسی کونے میں روپوش ہو گئی تھی۔ وہاں اب دھرم اور اونچ نیچ کا سوال نہ تھا۔

اُنھوں نے سوہنیا کی گود سے اٹھا کر رمیش کا سر اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ میرے بچے! میرے رمیش! یہ اُن کی آواز کانپ رہی تھی۔ زمیندارنی جی سراسیمہ ہو کر ننگے سر دوڑ پڑی تھیں۔ اور رمیش کے خون سے لتھڑے ہوئے منہ کو بے تحاشہ چوم رہی تھیں۔ سرونج کی تھالی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گری تھی دودھ جیسی سفید ساڑی کا آنچل اُس کے ماتھے پر لرز رہا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں کھُلی تھیں۔ ان میں آنسو نہیں تھے۔ خوف بھی نہیں تھا۔ مسکراہٹ بھی نہیں تھی نامعلوم سی وحشت برس رہی تھی۔

پجاری، برہمن، پنڈت سب چپ چاپ کھڑے تھے۔ مندر کے صحن میں اور بھی کئی نیچ زخمی ہو کر گر پڑے تھے۔ کسی کے سر سے خون نکل رہا تھا۔ کسی کا ماتھا پھٹ گیا تھا۔ کوئی بیہوش ہو گیا تھا۔ کوئی درد سے چلّا رہا تھا اور زمیندار جی کی بوڑھی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اُن کی سفید مونچھیں کانپ رہی تھیں۔ زمیندارنی بی بین کر رہی تھیں۔ "میرے لال! یہ تیرا جوان جوان گرم گرم جیتا لہو۔ ہائے جن آنکھوں سے یہ خون دکھائی دے رہا ہے۔ وہ اندھی کیوں نہ ہو گئیں۔ ہائے یہ لاٹھیاں، یہ پتھر مجھ پر کیوں نہ برس گئے۔ ہائے میری کوکھ اجڑ گئی"

بھجن رک گئے۔ مندر پر بوجود کراہوں اور سسکیوں کے ایک سناٹا سا چھا گیا تھا۔ رمیش

نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ دھیرے دھیرے اس کے ہونٹ کلبلائے۔ "ڈیڈی! یہ بھی تو..... مندر...... میں پوجا کرتا ہوں ...... یہ خون میرا مان...... ہے...... مگر ڈیڈی..... شمبھو دادا کی پوجا..... انھیں بھی تو پوجا کا حق......"

سرونج کے ہونٹ بھنچ گئے ـــــ زمیندارنی جی کی چیخوں میں اضافہ ہوگیا۔ ایکدم زمیندار جی کھڑے ہو گئے۔ اُن کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ اور ان کا وزنی جسم خزاں کے سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اُن کے چہرے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی پوری طاقت لگا کر بولے:

"آپ سب لوگ مندر میں آجائیے۔ اور پوجا کیجئے۔ یہ اپنی طرح کی ایک ہی پوجا ہوگی۔ یہاں کتنوں نے اپنا خون دیا۔ مگر میرے رمیش نے......" وہ بڑی مشکل سے بول پا رہے تھے۔ "مگر میرے رمیش نے اپنا خون ہی نہیں دیا۔ بلکہ اپنے پران بھی دیدیئے۔ مجمع میں حرکت ہوئی اور ایکدم کئی لوگ اندر گھس پڑے۔

پجاری خاموش تھے ـــــ برہمن خاموش تھے ـــــ پنڈت خاموش تھے ـــــ زمیندار جی خاموش تھے ـــــ نیچ لوگ دھیرے دھیرے پاک اور پوتر مندر میں داخل ہو رہے تھے۔ رمیش نے بڑی مشکل سے یہ سب دیکھا اور اس کے مرتے ہوئے ہونٹوں پر بڑی معصوم سی مسکراہٹ بکھر گئی ـــــ

زمیندار جی تڑپ اُٹھے۔ موٹے موٹے آنسوؤں کی کئی بوندیں اُن کی آنکھوں سے چھلک پڑیں۔ وہ رمیش پر جھکے، اُس کے خون آلودہ منہ کو چوم کے بڑی مشکل سے بولے۔

"رمیش بیٹا! ـــــ میں آج ہی شمبھو کی گائے اور بچھیا اس کے گھر بھجوائے دیتا ہوں۔"

سوہنیا نے اُٹھ کر مندر کی گھنٹیوں کو جھلا جھلا دیا اور نیچ لوگ زور زور سے بھجن گانے لگے۔

○ واجدہ کی روح سے ایک قطرۂ صداقت نکلا اور کچھ دیر قلم میں رکا ...... پھر "جیسے دریا" سمندر میں مل جاتا ہے۔ وہ قطرہ سفید کاغذ کی موجوں میں مل کر ایک بے پناہ طوفان بن گیا۔

"جیسے دریا"

واجدہ تبسم کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ

صفحات ۳۰۴ قیمت ۲۰ روپے

○ واجدہ جس تخت پر بیٹھی ہے وہ ادب کا تخت طاؤس ہے جس میں مختلف کہانیوں کے لعل، ہیرے، زمرد اور موتی جڑے ہوئے ہیں اور ہر ہیرے سے سچائی کی کرنوں کا انعکاس ہو رہا ہے۔ سورج کو دیکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کی کرنوں سے نگاہیں چار کی جائیں۔

واجدہ تبسم کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ "تخت طاؤس"

صفحات ۳۰۴ ، قیمت ۲۰ روپے

○ ہری بھری تحریر لکھنے والی واجدہ تبسم کے قلم سے ایک رہرا بھرا ناول "پھول کھلنے دو" ان لوگوں کے لئے۔ جو سدا امیدوں کے بیج بو کر دکھوں کی فصل کاٹتے رہے ہے، وہ لوگ جو پیروں سے کچلے جاتے رہے، اُن کے لئے ایک نئی روشنی اور صبح کی امید ــــ بعض پستیاں بھی کتنی بلند ہوتی ہیں! ماتھا، سر آنکھ۔ ناک اونچائی پہ ہوتے ہیں لیکن عقیدت کے اظہار کیلئے صرف پاؤں کو ہی چھوا جاتا ہے۔ ہریجن جاتی کے دبے، کچلے، پسے ہوئے معصوم انسانوں پر لکھا گیا ایک انقلابی ناول ــ اس قلم سے جو سدا مظلوموں کی حمایت میں اٹھا ہے۔

صفحات ۲۵۰، دوسرا ایڈیشن زیر طبع قیمت ۲۰ روپے

"اُترن" واجدہ کہتی ہیں

"یہ داستانیں اور افسانے میں نے اس لئے نہیں لکھے ہیں کہ لوگ انھیں پڑھ کر چٹخارے بھریں، واہ، واہ کریں، یا مجھے داد دیں۔ میں نے تو انہیں کاغذ پر یوں منتقل کیا ہے کہ میں جانتی تھی اگر میں نے انہیں صرف محلوں اور حویلیوں میں رہنے دیا تو وہ ہمیشہ کے لئے وہیں دفن ہو کر رہ جائیں گے، اور یہ خزانے وقت کی تہ در تہ گرد میں گم ہو کر مدفون ہو جاتے تو حالات کی تیز آندھی بھلے ہی کھل جا سم سم کا کتنا ہی ورد کرتی وہ در کبھی وا نہ ہوتے۔

میرا سارا قصور یہ ہے کہ مجھے وہ منتر یاد تھا جو بند دروازوں کو کھول دیتا ہے۔"

حیدرآبادی زبان میں دکنی ماحول پر افسانے۔ دوسرا ایڈیشن۔ زمین آسمان اور پاگل خانہ کیساتھ

ضخامت ۳۰۴ صفحات قیمت ۲۰ روپے

○

واجدہ واضح طور پر یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ہم انسانی تعلقات کی بنیاد کو غلط سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ سرمائے پر قطعی مبنی نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، جو محبّت کے بغیر ممکن نہیں ——— واجدہ کی کہانیوں کی بنیاد وہ عالیشان محلات ہیں جن کی، دیواریں گرتی جاتی ہیں اور ان دیواروں کے ساتھ ایک پوری تاریخ زمین میں دفن ہو جاتی ہے آج ہمیں اس محبّت کی اشد ضرورت ہے اس کے بغیر ہم جی نہیں سکتے۔" محبّت گرتی ہوئی دیواروں تک کی بنیادوں میں بھی دفن ہو تو ہمیں کھود کر نکالنی پڑے گی۔"

آیا بسنت سکھی

طویل افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت ۲۰ روپے

پھول کھلنے دو
واجدہ تبسم
قیمت ۱۲ روپے